اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

اگست ۲۰۲۱ء

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ڈاکٹر محمد امین کی تازہ تالیف

اسلام اور ردِّ مغرب

مغربی تہذیب خلافِ اسلام ہے اور اس کا ردّ شرعاً واجب ہے

- مغربی تہذیب کے قابل ردّ ہونے کے نو (۹) شرعی و عقلی مبسوط دلائل
- ردّ مغربی تہذیب کے موقف پر اشکالات و اعتراضات کا جائزہ
- ردّ مغربی فکر و تہذیب کے تقاضے

ڈاکٹر محمد امین

صفحات: ۲۱۶

قیمت: ۲۵۰ روپے بغیر ڈاک خرچ

مکتبہ البرہان، لاہور

ڈاکٹر محمد امین کی تازہ تالیف

خاموش انقلاب ناگزیر ہے

ریاست اگر ساتھ نہ بھی دے تو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسّی فیصد سے زیادہ اسلام پر عمل کیا جا سکتا ہے۔

صفحات ۲۸۸ قیمت ۲۵۰ روپے

مکتبہ البرہان

15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

فون: 0309-4607124، ای میل ermpak@hotmail.com

ماہنامہ

البرہان لاہور

جلد ۲۵، شمارہ ۸، اگست ۲۰۲۱ء/ ذوالحجہ ۱۴۴۲ھ

مشمولات

○فکرونظر

نادان دوست — مدیر — ۴

○تعلیم وتربیت

۔غیر ملکی پبلشر کی کتاب پر پابندی — عامر خاکوانی — ۵

۔یکساں قومی نصاب اور دینی مدارس کا نظامِ تعلیم — ڈاکٹر اکرام الحق — ۷

۔تعلیم میں بعض علماء کرام کی مغرب سے مرعوبیت — مدیر — ۱۱

○تزکیۂ نفس

مَیں اللہ کا شکر کیوں ادا کروں؟ — جاوید چوہدری — ۱۲

○اسلام اور پاکستان

۔ گھریلو تشدد بل: ہم غافل لوگ — ڈاکٹر محمد امین — ۱۶

۔ گھریلو تشدد بل کی اساس مغرب کی الحادی تہذیب ہے — ۱۷

۔ مغرب پاکستان میں غیر اسلامی قانون سازی کیسے کراتا ہے؟ — عاصم حفیظ — ۲۱

۔ اجتماعی قربانی خلافِ مقاصد شریعت ہے — مولانا احتشام صدیقی — ۲۶

○اسلام اور مغرب

۔مغربی تہذیب دینِ کفر اور دینِ غیر اللہ ہے — مدیر — ۲۸

۔ مغربی مفکرین اور فلاسفہ کے افکار و آراء (آخری قسط) — ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری — ۳۴

○عالم اسلام

عصر حاضر کا مجاہد اعظم — ادارہ — ۴۲

○استفسارات

جدید اسلامی تحریکیں کیوں کامیاب نہیں ہو سکیں؟ — مدیر — ۵۸

مدیر: ڈاکٹر محمد امین

نائب مدیر: پروفیسر ملک محمد حسین

انچارج سرکولیشن

(0309-4607124)

[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِ اعانت: فی شمارہ 45 روپے

سالانہ 500 روپے۔ پانچ سال: 2000 روپے

تاحیات 10,000 روپے

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ

سونیری بنک لمیٹڈ، مین برانچ، لاہور

A/c # 02011478219

برائے رابطہ

A-97 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور 54700

ادارتی امور

ermpak@hotmail.com

برائے آن لائن مطالعہ

www.alburhanmonthly.org

کمپوزنگ: حافظ محسن یوسف

0306-4640366

فکرونظر

نادان دوست

طالبان افغانستان کو ان کے بیس سالہ جہاد کی کامیابی مبارک۔ پاکستان اور امت مسلمہ کے اہل دین کو بھی عصر حاضر اور عالم کفر کے فرعون (امریکہ و یورپ) کی شکست پر مبارکباد۔ یہ محض اللہ کے فضل اور مجاہدین افغانستان کی مسلسل اور بے پناہ قربانیوں کی بدولت ممکن ہوا۔

اب اس جہاد کا آخری حصہ باقی ہے کہ دشمن کے ایجنٹ مقامی حکمرانوں کا صفایا کر دیا جائے اور اقتدار کلی طور پر مجاہدین کے حصے میں آجائے جس کے وہ جائز طور پر حق دار ہیں۔

ہمیں مجاہدین کی فراست سے توقع ہے کہ وہ ان نادان دوستوں کے مشورے سے بچیں گے جو ان کو اس جمہوریت اور انتخابات کا مشورہ دے رہے ہیں جو انہی اسلام اور مسلم دشمن اہل مغرب کے ملحدانہ افکار (ہیومنزم، سیکولرزم، لبرلزم، کیپٹل ازم وغیرہ) کی پیداوار ہے اور ان کو انہی اہل مغرب کی معاشی امداد (بذریعہ آئی ایم ایف، ورلڈ بینک) اور تعلیمی امداد (بذریعہ یونیسکو اور یونسیف) قبول کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ اہل دین کس مسلم ملک میں اس جمہوریت کے ذریعے نفاذ شریعت اور غلبۂ اسلام میں کامیاب ہوئے ہیں؟ کیا وہ تاریخ سے سبق سیکھنے کے اہل بھی نہیں رہے؟

مسلمانو! یاد رکھو! مغربی فکر و تہذیب دینِ کفر ہے، دینِ غیر اللہ ہے۔ اس کا رد اہلِ ایمان پر واجب ہے۔ اس کی پیروی مسلمانوں پر حرام ہے۔ مسلمانوں کے لیے راہِ عمل صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ وہ اسلام کی طرف لوٹ جائیں۔ اپنا سیاسی نظام، معاشی نظام، تعلیمی نظام.... اپنے عقائد، اپنی روایات، اپنی اقدار کے مطابق وضع کریں اور اس پر عمل کریں۔

اپنی ملت کو قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

تعلیم و تربیت

عامر خاکوانی

غیر ملکی پبلشر کی کتاب پر پابندی

آکسفورڈ والوں کی ایک کتاب پر پابندی لگی۔ وجہ یہ تھی کہ انہوں نے پنجاب ٹیکسٹ بورڈ سے این او سی نہیں لیا۔ این او سی لینے کی پالیسی پر سختی سے عمل درآمد ہو رہا ہے، کئی پبلشرز کی کتابیں ضبط ہو چکی ہیں۔

بات سادہ اور واضح ہے کہ ہر کام کسی طریقے، قرینے سے ہونا چاہیے۔ حکومت ایک نصاب پر کام کر رہی ہے، اس کے لئے پچھلے ڈیڑھ دو برسوں سے کاوش جاری تھی۔ بنیادی نکتہ یہی ہے کہ ہر کوئی اپنی مرضی سے کتابیں چھاپ کر اپنے سکول سسٹم میں شامل نہ کرے بلکہ ایک طے شدہ، متفقہ نصاب ہو۔ اسی لئے مختلف پبلشرز پر سختی کی جا رہی ہے کہ وہ اپنی کتابیں، خواہ وہ کسی بھی کلاس کے لئے ہوں، انہیں ٹیکسٹ بورڈ سے منظور کرائیں۔ یہ قابل تعریف، قابل ستائش پالیسی ہے۔ ایسا ڈسپلن قائم کرنا چاہیے اور آکسفورڈ اور کیمبرج جیسے بڑے اداروں کو بھی رعایت نہیں دی جانی چاہیے۔

دوسری طرف اس خبر کو یوں چھپوایا اور پھیلایا گیا کہ چونکہ ملالہ یوسف زئی کی تصویر کتاب میں شامل کی گئی، اس لئے کتاب ضبط ہوئی ہے۔ یہ بات اس لئے درست نہیں کہ پہلے کئی دیگر پبلشرز کی وہ کتابیں بھی ضبط ہو چکی ہیں، جن کا ملالہ کی تصویر سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ یہ خبر دانستہ طور پر فیڈ کی گئی، کرائی گئی۔ مقصد کنفیوژن پھیلانا اور آکسفورڈ کے لئے حمایت جمع کرنا اور ملالہ کے حامیوں کو اسے گلوریفائی کرنے کا موقعہ دیا جانا تھا۔ بات اصول کی ہے، آکسفورڈ یا کسی بھی پبلشر کو پہلے اپنے متن کے حوالے سے این او سی لینا چاہیے۔ نہ لینے پر وہ کتاب ضبط کر لی جائے۔

یہ تو ہو گیا اس خبر کا معاملہ۔ سوال یہ ہے کہ ملالہ یوسف زئی کی تصویر اس کتاب میں شامل کرنے کی کیا تک اور منطق تھی؟ قائداعظم، علامہ اقبال، لیاقت علی خان جیسے ہیروز کے ساتھ ملالہ یوسف زئی کی تصویر بطور قومی مشاہیر کیوں چھاپی جائے؟ اس کی کوئی معقول دلیل تو دی جائے۔ عبدالستار ایدھی کی تصویر ڈالی گئی، ایدھی صاحب نے اپنی تمام عمر انسانیت کی خدمت میں گزار دی۔ پاکستان میں کوئی اور شخص ہے جس نے ایدھی جتنے ایثار، قربانی اور بے لوثی سے کام لیا ہو؟ کوئی نہیں۔ میجر عزیز بھٹی شہید کی تصویر ڈالی گئی، نشان حیدر لینے والے اس قومی ہیرو کی تصویر

کی وجہ اور منطق ہے۔ خاص کر جب دہشت گرد ملک پر ہر طرف سے حملہ آور ہوں اور پولیس، فورسز کے جوان افسر اپنی جانوں کی بازی لگا رہے ہوں، تب تو میجر عزیز بھٹی شہید یا کیپٹن کرنل شیر خان، لالک جان یا کسی دوسرے شہید کی تصویر ضرور آنی چاہیے تا کہ پتہ چلے کہ قوم اپنے شہدا کی کتنی تکریم کرتی ہے۔ ملالہ یوسف زئی نے اس قوم یا ملک کے لئے کیا قربانی دی ہے؟ ان کا کیا کنٹری بیوشن ہے؟ تعلیمی حوالے سے انہوں نے یہاں پر ایسا کیا کرلیا کہ انہیں محسن پاکستان یا قومی مشاہیر میں سے ایک گنا جائے؟

میرا ملالہ یوسف زئی سے کوئی مسئلہ نہیں، وہ ہماری ہی بچی ہے۔ خوش بختی کی دیوی اس پر بے پناہ مہربان ہوئی۔ اسے بغیر کچھ کئے نوبیل انعام مل گیا۔ دنیا کی تاریخ کی یہ واحد مثال ہے جسے زیرو پرسینٹ سماجی خدمت، تعلیمی خدمت، ادبی خدمت یا کسی بھی اور کنٹری بیوشن کے بغیر صرف اس لئے نوبیل انعام ملا کہ وہ مغرب کے پسندیدہ امیج میں فٹ ہوتی ہے، ایک ملک میں ہارتی ہوئی مغربی افواج کو ایسا آئیکون چاہیے تھا، جس میں رنگ بھر کر وہ خود کو اپنے حریفوں سے برتر محسوس کر سکیں۔ ملالہ دنیا کی سب سے نوعمر نوبیل انعام یافتہ ہے۔ یہ بات ایم سی کیوز میں ضرور آنی چاہیے۔ یہ معلومات عامہ کا سوال ہے۔ اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے، مگر ملالہ ملک و قوم کی ہیرو، محسنہ یا مشاہیر میں نہیں۔ اللہ کرے کہ ملالہ اپنے وطن، قوم کے لئے ایسا کچھ کرے، ایسی سماجی خدمت کرے کہ اسے مشاہیر میں شامل کیا جائے۔ اللہ کرے کہ ایسا ہو، تب اس کا نام مشاہیر کے ساتھ قومی نصاب میں ضرور شامل کیا جائے۔ اب یہ نہیں بنتا۔ اور آکسفورڈ یا کسی بھی دوسرے تعلیمی ادارے کو یہ حق نہیں دیا جاسکتا کہ وہ اپنی مرضی کے ہیرو چنے اور انہیں ہماری نئی نسل کو مشاہیر کے طور پر روشناس کرائے۔

کہا جارہا ہے کہ اسی کتاب میں ملالہ کی تصویروں کے ساتھ بیگم رعنا لیاقت علی خان کی تصویر بھی تھی۔ معذرت کے ساتھ بیگم رعنا بھی قابل احترام تو ضرور ہیں مگر وہ بھی مشاہیر قوم میں سے نہیں۔ وہ لیاقت علی خان کی اہلیہ کے طور پر قابل احترام ہیں۔ بعد میں انہیں پاکستان کا سفیر بھی بنایا گیا۔ سینکڑوں ہزاروں سفیروں کی طرح ایک سفیر۔ ان کی مگر ایسی خدمات نہیں کہ ان کا شمار مشاہیر میں کیا جائے۔ البتہ مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کو یہ درجہ ضرور حاصل ہے۔ وہ صرف قائد کی ہمشیرہ نہیں تھیں، بلکہ بعد میں ایک ڈکٹیٹر کے خلاف پوری قوت کے ساتھ کھڑی ہوئیں۔ انہوں نے جمہوریت، سیاسی قوتوں اور عوام کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کیا اور ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ صرف یہ کام ہی انہیں مشاہیر میں شامل کرانے کے لئے کافی ہے۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۳۳)

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر اکرام الحق یاسین[1]

یکساں قومی نصاب اور دینی مدارس کا نظامِ تعلیم

(۲۱ر جون ۲۰۲۱ء کو تنظیم اساتذہ پاکستان، اسلام آباد کے زیر اہتمام قومی مشاورتی سیمینار بعنوان" یکساں قومی نصاب: اہمیت، تقاضے اور خدشات" سے خطاب)۔

یہ ایک ایسی علمی مجلس ہے جس میں میرے اساتذہ کرام اور میدان تعلیم و تعلم کے اساطین تشریف فرما ہیں۔ میرے لیے لب کشائی کا کوئی موقع نہیں بنتا۔ یہاں بیٹھ کر اپنے بڑوں کی باتیں سن لینا ہی بہت بڑا اعزاز ہوگا۔ تاہم چونکہ پروگرام میں نام شامل ہوگیا ہے اس لیے اپنے اساتذہ کو اُنہی کا دیا ہوا سبق سنانے کی کوشش کروں گا تا کہ اس میں اصلاح ہو سکے۔

خواتین وحضرات! ملک میں تیار ہونے والا یکساں تعلیمی نصاب اپنے اندر بہت سے قابل بحث نقاط اور بہت سے قابل تحقیق گوشے رکھتا ہے۔ مدارس دینیہ کے حوالے سے جو وژن اس نصاب میں نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ مدارس بھی مین سٹریم ایجوکیشن میں شامل ہو کر اپنے فضلا کو ملک اور معاشرے کے لیے مفید تر بنا سکیں، انہیں ملازمتیں مل جائیں اور ترقی کرنے کے مواقع میسر ہوں۔

میرے خیال میں نصاب تعلیم اور نظام تعلیم مرتب کرتے وقت مقصدِ تعلیم کو پیش نظر رکھنا از حد ضروری ہے۔ مدارس کے نظام کی بنیادیں ہمیں مغل شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر [م: فروری ۱۷۰۷ء] کے زمانے میں ملتی ہیں جب ملا نظام الدین سہالوی رحمہ اللہ [م: مئی ۱۷۴۸ء] نے اُس وقت کے جدید اور روایتی علوم پر مشتمل یہ نصاب تیار کیا اور تقریباً ۱۵۰ سال تک حکومتی سرپرستی میں اس نصاب کی تعلیم جاری رہی۔ ۱۹۵۷ء میں ہندوستان پر انگریز کے مکمل قبضے کے بعد جب نظام تعلیم میں بنیادی تبدیلیاں کی گئیں اور دینی علوم کا حصہ نظام تعلیم میں بہت کم رہ گیا تو اس وقت کے علماء نے ملا نظام الدین سہالویؒ کے نظام کو ہی، جو درس نظامی کے عنوان سے مشہور تھا، الگ دینی مدارس قائم کر کے جاری رکھا اور حسب ضرورت اس میں کچھ تبدیلیاں کر دیں۔ ان مدارس کا مقصد معاشی نہیں تھا، دعوتی اور دینی رہنمائی کا تھا۔ اس وقت سے لے کر آج تک یہ مدارس اسی

---

[1] سیکرٹری جنرل، اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد

دعوے کے ساتھ چل رہے ہیں۔موجودہ حالات میں مدارس منبر ومحراب، جلسہ وجلوس اور وعظ وارشاد کے ذریعے دعوتی کام بخوبی سرانجام دے رہے ہیں اور نکاح وطلاق، وراثت اور حلال وحرام کی حد تک دینی رہنمائی بھی فراہم کر رہے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک اہم تبدیلی یہ آئی ہے کہ مدارس کی تنظیموں کی رضامندی سے اُنہیں سرکاری ملازمتوں اور معاشی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لیے بھی اجازت نامے جاری کیے گئے ہیں۔اب جب یکساں نظام تعلیم کی بات ہوتی ہے تو اس میں دوسرا یعنی معاشی پہلو نمایاں نظر آتا ہے اور اس میں دعوت وارشاد، وعظ ونصیحت کے پہلو کافی حد تک کمزور نظر آتے ہیں۔دوسری طرف وفاقی حکومت کا اوقاف بل بھی محل نزاع بنا ہوا ہے۔اوقاف بل کا مدارس کے مالیاتی نظام کے ساتھ گہرا تعلق ہے، جس سے خطرہ یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ ایک تو مدارس کے نظام اور خصوصاً مالیات میں حکومت کا عمل دخل کلیدی حیثیت حاصل کر جائے گا اور مدارس کی اٹانومی بری طرح متأثر ہوگی اور دوسرے یہ کہ جب چندے جمع کرنے اور وقف وصول کرنے کی نسبت حکومت سے ہو جائے گی تو چندے بھی بند ہو جائیں گے اور زمینیں اور جائیدادیں وقف کرنے کا سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا جس کا لازمی نتیجہ مدارس کی بندش، یا انتہائی مشکلات کی صورت میں ہوگا۔مدارس کے روایتی کردار کے بارے میں بھی خدشات کا اظہار کیا جا چکا ہے کہ نئے یکساں نصاب میں جان نہیں ہے کہ اس سے یہ کردار ادا کرنے کی توقع کی جا سکے۔

مدارس کے ان خدشات پر تو انتظامی اور ملکی سطح پر غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔البتہ مدارس کے نصاب کے لحاظ سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جو کردار مدارس صدیوں سے ادا کر رہے ہیں، وہ دور حاضر تک پہنچتے پہنچتے اپنی افادیت کھو چکا ہے۔مدارس میں عربی زبان کی تعلیم کو دیکھیں تو صَرف کی گردانوں کے رٹے لگانے اور نحو میں "ضرب زید عمرا" کے تکرار سے نہ تو زبان آتی ہے اور نہ ہی موجودہ دور کے عرف کے ساتھ اس کا کوئی ربط قائم ہو پاتا ہے۔اس کے مقابلے میں عرب دنیا میں بہت سی ایسی کتابیں تصنیف کی جا چکی ہیں جو جدید طریقوں سے عربی زبان بھی سکھاتی ہیں اور قواعد واملا بھی سکھا لیتی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ دور جدید کی عملی مثالوں اور تعبیرات پر مشتمل ہیں جس سے انسان کو ایک زندہ زبان سیکھنے کا احساس ہوتا ہے۔مدارس میں موقوف علیہ تک باقی تمام فنون کا حال بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔وعظ وارشاد کے لیے قرآن مجید اور سیرت وحدیث بنیادی ذرائع ہیں، مدارس کے نصاب میں قدیم روایتی اردو

تراجم اور جلالین شریف اور بیضاوی پر اکتفا کیا جاتا ہے جن سے دور جدید میں قرآن مجید سے کم ہی کوئی اطلاقی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ سیرت تو ویسے بھی نصاب کی ترجیحات میں شامل نہیں ہے۔

جہاں تک شخصی اور خاندانی مسائل میں رہنمائی کا تعلق ہے تو ایک طرف جدید ایجادات نے نکاح وطلاق کے پورے سسٹم کو بدل کر رکھ دیا ہے اور دوسری طرف قوانین اور قرون وسطیٰ کے فقہی متون اور شروح میں زمین وآسمان کا فرق ہے، مگر ان دونوں کا مخاطب ایک ہی ہے۔ ایک ہی شخص جو شریعت پر چلنا اور جنت میں جانا چاہتا ہے اسے مفتی صاحب بتاتے ہیں کہ آپ کی طلاق ہوگئی اور فلاں فلاں صورتوں کے بغیر آپ کی ازدواجی حیثیت بحال ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے، قانون کہتا ہے کہ آپ کی طلاق نہیں ہوئی۔ ہم یہاں یہ بحث نہیں کررہے ہیں کہ کون غلط ہے اور کون صحیح ہے، مگر دور جدید کے انسان کا یہ حق بنتا ہے کہ شریعت کی رہنمائی میں اسے بتایا جائے کہ وہ اپنے معاملات میں قانون اور شریعت کو کیسے جمع کرسکتا ہے۔ قوانین میں ترمیم ایک بالکل الگ فیلڈ ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل اس کے لیے ایک سے زائد مرتبہ یہ سفارش کرچکی ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں مگر چونکہ یہ قرآن وسنت کے احکامات کی صریح خلاف ورزی ہے اور یہ طلاقِ بدعت شمار ہوتی ہے اس لیے ایسے بدعتی شخص کو تعزیری سزا ہونی چاہیے اور جو وکیل اور منشی اس کی مدد کرے انہیں بھی سزا میں شامل کرنا چاہیے۔ کونسل نے یہ سفارش کئی مرتبہ کی ہے۔ اگر قانون میں ترمیم نہیں ہوتی یا دیر سے ہوتی ہے تو عام آدمی کو مسائل بتاتے وقت اس پر تو تیار کیا جاسکتا ہے کہ بیک تین طلاقوں کے رواج کی حوصلہ شکنی کی جائے بلکہ ممکنہ حد تک قانون کے مطابق طلاق کے نوٹس جاری کریں جس میں یہ احتیاط شامل ہو کہ شرعی حدود کے دائرے کے اندر رہیں۔ کونسل کے کئی اجلاسوں میں ہلکی ہلکی آوازیں اس پر بھی اٹھیں کہ نکاح رجسٹریشن کی طرح طلاق رجسٹریشن کا بھی نظام جاری کیا جائے مگر معاشرتی مشکلات کو دیکھ کر بات آگے نہ بڑھ سکی۔ نکاح نامے کا موجودہ فارمیٹ کئی مرتبہ کونسل میں زیرغور آچکا ہے۔ اس طرح کی بیسیوں مثالیں دی جاسکتی ہیں جن کی تعلیم وتدریس کی مدارس میں ضرورت ہے۔ عرب دنیا میں ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے بہت بڑا فقہی کام کردیا ہے اس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سا لٹریچر اس سلسلے میں میسر ہے۔

ہماری فقہی کتب میں ابھی تک غلاموں اور لونڈیوں کے احکام، گھوڑوں اور جانوروں کی زکوٰۃ اور غیر مسلموں سے جزیہ اور خراج لینے کے احکام پڑھائے جا رہے ہیں۔ چند ہی دن پہلے کی بات ہے، پی ایچ ڈی میں بلاسفیمی لاء کے بارے میں ایک مقالہ مدرسے کے ایک فاضل نے لکھا، اس میں روایتی فقہی احکام کی بھرمار ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بات دیکھ کر انتہائی پریشانی ہوئی کہ وہ صاحب لکھ رہے ہیں: ان أساء الذمی إلی الرسول ﷺ یفسد عهد ذمته یعنی اگر کوئی ذمی رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کرے گا تو اس کا عہد ذمہ ختم ہو جائے گا۔

جب مَیں نے پوچھا کہ دور جدید کا ذمی کون ہے اور ذمی کی تعریف کیا ہے، تو کوئی جواب نہیں ملا۔ جب مَیں نے اس کی جگہ شہریت کی بات کی تو اچھے خاصے اساتذہ کی طرف سے یہ سوال آیا کہ شہریت کے لیے مصدر کیا ہوگا؟ مجھے حیرت تو بہت ہوئی، مگر میں نے معصومیت سے عرض کیا کہ مصدر دستور پاکستان ہوگا، وہ دستور جو مولانا شبیر احمد عثمانی، ڈاکٹر حمید اللہ، مولانا مناظر احسن گیلانی، مفتی محمد شفیع، مولانا احتشام الحق تھانوی اور مولانا ظفر احمد انصاری نے اپنی علمی تحقیقات کے ذریعے بنوایا۔

میرے خیال میں ایک طرف اساتذہ کی ایسی مجالس کے ذریعے اور حکومت کے ساتھ مذاکرات کے ذریعے دینی علوم کے تحفظ اور تعلیم کی شدید ضرورت ہے، اور دوسری طرف ایسا لٹریچر عام کرنے کی ضرورت ہے جو عام فہم زبان میں ہو اور دور جدید کے عرف کے مطابق دینی ضروریات پوری کر سکتا ہو۔ اس کے لیے شعبان اور رمضان کے شارٹس کورسز، مدارس کی درجہ وار تقسیم، نصاب میں مرحلہ وار تبدیلی اور تعلیمی نظام میں تدریس کے علاوہ تحقیق، علمی اجتماعات اور تبادلہ خیالات کو شامل کر کے اس کی راہ ہموار کی جا سکتی ہے۔ وآخر دعوانا انِ الحمد للہ رب العلمین.

تعلیم و تربیت/استفسارات　　　　مدیر

تعلیم میں بعض علماء کرام کی مغرب سے مرعوبیت

استفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین بیچ اس مسئلے کہ کیا کوئی مسلمان ایسے تعلیمی ادارے میں بچہ داخل کرواسکتا ہے جہاں داخلے کی شرط حفظِ قرآن ہو لیکن داخلہ ہونے کے بعد وہ ادارہ اپنے تدریسی اوقات میں سے ایک بھی پیریڈ منزل (یعنی قرآن) کی دہرائی کا نہیں رکھتا اور نہ ہی بچے کو اتنا وقت دیتا ہے کہ بچہ اپنی منزل دہرا سکے بلکہ نمازوں سے دس منٹ پہلے اور بعد کے وقت کو منزل دہرائی کا نام دے دے جس میں اکثر بچوں کے لیے منزل دہرانا ممکن ہی نہیں۔ ایسا ادارہ تین چار سال تک بچوں کو انگریزی تعلیم میں شدید مصروف رکھتا ہے مگر قرآن کی دہرائی کا پیریڈ مختص کرنے سے انکاری ہے اور بچے کل وقتی ایسے ادارے میں رہائش پذیر بھی ہوں تو ایسے ادارے میں داخلے کا کیا شرعی حکم ہے؟

البرہان: اوّل تو یہ کوئی ایسی بات نہیں جس پہ فتویٰ لیا جائے یا دیا جائے اور نہ راقم نے کبھی فتویٰ دیا ہے تاہم اس سے راقم کا یہ تاثر پختہ ہوا کہ بدقسمتی سے ہمارے بعض علماء کرام مغربی فکر و تہذیب اور اس کی زبان سے مرعوب ہیں۔ ہمارے علم میں ایسے کئی علماء کرام ہیں جو مدارس بھی چلاتے ہیں اور ساتھ ہی انگلش میڈیم، مونٹی سوری، او اے لیول طرز کے جدید سکول بھی چلاتے ہیں اور بعض تو طلبہ سے بھاری فیسیں بھی وصول کرتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ طرزِ عمل غلط ہے اور قابلِ اصلاح ہے بلکہ ہمارے ایک دوست تو ایسے علماء کی سخت مذمت کرتے ہیں۔ ان کا مؤقف یہ ہے کہ عام آدمی مغربی تہذیب سے مرعوب ہو کر اس کی پیروی کرنے لگے تو یہ قابلِ فہم ہے لیکن علماء کو تو مغربی تہذیب کی دجالیت، خباثت اور ضرر کو سمجھنا چاہیے اور اسے رد کرنا چاہیے۔

مذکورہ سکول کے طرزِ عمل سے ظاہر ہے کہ وہ انگریزی کی تعلیم کو قرآن کے یاد کرنے اور رکھنے پر فوقیت دیتا ہے جو درست طرزِ عمل نہیں ہے اور اسے اس کی اصلاح کرنی چاہیے۔ مستفسر کو سکول مالکان سے مل کر ان کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے۔

تزکیۂ نفس جاوید چوہدری

مَیں اللہ کا شکر کیوں ادا کروں؟

ایک بزنس مین

وہ اتوار کے دن میرے پاس تشریف لائے اور دو گھنٹے میرے پاس بیٹھے رہے۔ یہ ''موسٹ پریکٹیکل'' انسان ہیں۔ قسمت، قدرت اور خدا پر یقین نہیں رکھتے۔ کوشش کو بے انتہا اہمیت دیتے ہیں۔ بزنس مین ہیں۔ پوری زندگی پیسہ کمایا اور پیسہ جوڑا لیکن پھر اچانک ان کا رویہ ۱۸۰ درجے بدل گیا۔ یہ اب روز اللہ کا نام بھی لیتے ہیں اور اس کی نعمتوں کا ورد بھی کرتے ہیں، نماز بھی پڑھتے ہیں اور ان کا دل بھی بہت نرم ہو چکا ہے۔ اب وہ ہر لمبی سانس کے ساتھ ''یا اللہ تیرا شکر ہے'' کہتے ہیں اور اوپر دیکھتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا ''عزیز بھائی! خیریت ہے، آپ بالکل ہی تبدیل ہو گئے ہیں''۔ وہ بولے کورونا کی مہربانی ہے میں وبا کا شکار ہوا، سانس بند ہونے لگی، بچے اسپتال لے گئے، علاج ہوتا رہا، ڈاکٹروں نے آخر میں آئی سی یو میں ڈال دیا، اسپتال پرائیویٹ تھا، روزانہ ایک لاکھ سولہ ہزار روپے خرچ ہوتے تھے۔

میں بیس دن اسپتال رہا، اللہ نے رحم کیا، موت کی سرحد چھو کر واپس آ گیا۔ ڈسچارج ہوتے وقت بل دیکھا تو ۳۱ لاکھ روپے تھا، میں نے ڈاکٹر سے کہا: آپ مجھے ۲۰ دنوں میں جو ادویات اور سہولتیں دیتے رہے کیا آپ مجھے اس کا بریک ڈاؤن دے سکتے ہیں؟ ڈاکٹر پریشان ہو گئے، میں نے زور دیا تو وہ مان گئے۔

نیا بل سامنے آیا تو پتا چلا مجھے ۹ لاکھ روپے کی آکسیجن لگی تھی۔ بس یہ دیکھنے کی دیر تھی، مَیں نے وضو کیا، دو نفل پڑھے اور اپنے پروردگار کا شکر ادا کیا، یہ روز مجھے ۵۵۰ لیٹر آکسیجن بھی دیتا ہے اور اس آکسیجن کو پھیپھڑوں تک پہنچانے اور واپس نکالنے کا بندوبست بھی کرتا ہے اور اس کے بعد مجھے کوئی بل بھی نہیں بھجواتا۔ آپ جاوید تصور کرو، ۲۰ دن تک آکسیجن پھیپھڑوں تک پہنچانے اور نکالنے کا خرچ ۹ لاکھ روپے اور ٹوٹل خرچ ۳۱ لاکھ روپے تھا جب کہ ہمارا اللہ ہمیں یہ سہولت روزانہ مفت دیتا ہے۔ ہم پر اس کا کتنا کرم، کتنی مہربانی ہے؟'' مَیں نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگایا' آسمان کی طرف دیکھا اور دیر تک اپنے رب کا شکر ادا کرتا رہا۔

ارشاد احمد حقانی مرحوم

میرے ایک سینئر دوست ہیں۔ سیاست دان ہیں۔ سینیٹر ہیں۔ بہت پڑھے لکھے۔ تجربہ کار اور سمجھ دار انسان ہیں۔ میں ہفتے دس دن بعد کافی کے دو مگ لے کر ان کے پاس پہنچ جاتا ہوں۔ ان کے ساتھ ان کے لان میں بیٹھتا ہوں۔ کافی اور ان کی گفتگو انجوائے کرتا ہوں۔ مَیں پچھلے ہفتے ان کے پاس گیا تو شاہ صاحب نے ارشاد احمد حقانی مرحوم کے بارے میں ایک واقعہ سنایا۔ ارشاد احمد حقانی پاکستان کے سینئر صحافی اور کالم نگار تھے۔ ایک معاصر میں کالم لکھتے تھے۔ میری پوری نسل ان کے کالم پڑھ کر جوان ہوئی اور ان سے لکھنا سیکھا۔ شاہ صاحب نے بتایا مَیں ۱۹۹۸ء میں ایران جا رہا تھا۔ ارشاد احمد حقانی سے ملاقات ہوئی۔

انہوں نے پوچھا کیا آپ مشہد بھی جائیں گے؟ میں نے عرض کیا ''جی جاؤں گا''۔ انہوں نے فرمایا ''آپ میرے لیے وہاں خصوصی دعا کیجیے گا''۔ میں نے وعدہ کر لیا لیکن اٹھتے ہوئے پوچھا ''آپ خیریت سے تو ہیں؟'' حقانی صاحب دکھی ہو کر بولے ''میری بڑی آنت کی موومنٹ رک گئی ہے۔ پاخانہ خارج نہیں ہوتا۔ مَیں روز اسپتال جاتا ہوں اور ڈاکٹر مجھے بیڈ پر لٹا کر مشین کے ذریعے میری بڑی آنت سے پاخانہ نکالتے ہیں اور یہ انتہائی تکلیف دہ عمل ہوتا ہے''۔ شاہ صاحب نے اس کے بعد کانوں کو ہاتھ لگایا، توبہ کی اور کہا ''ہمیں روز اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ہم اپنے منہ سے کھا بھی سکتے ہیں اور ہمارا کھایا ہوا ہمارے پیٹ سے نکل بھی جاتا ہے ورنہ دنیا میں ہزاروں لاکھوں لوگ اپنی مرضی سے کھا سکتے ہیں اور نہ نکال سکتے ہیں''۔

چوہدری شجاعت حسین

یہ بات سن کر مجھے بے اختیار چوہدری شجاعت حسین یاد آ گئے۔ چوہدری صاحب خاندانی اور شان دار انسان ہیں۔ میرے ایک دوست چند دن قبل ان کی عیادت کے لیے گئے۔ چوہدری صاحب خوش تھے اور بار بار اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہے تھے۔ میرے دوست نے صحت کے بارے میں پوچھا تو چوہدری صاحب نے جواب دیا ''میں بہت امپروو کر رہا ہوں۔ مَیں اب اپنے منہ سے کھا بھی لیتا ہوں اور اپنے پاؤں پر کھڑا بھی ہو جاتا ہوں''۔ دوست نے پوچھا ''آپ کی حالت اس سے پہلے کیسی تھی؟'' چوہدری صاحب بولے ''میری ٹانگیں میرا بوجھ نہیں اٹھاتی تھیں

اور میرے پیٹ میں ٹیوب لگی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر مجھے اس کے ذریعے کھلاتے تھے۔ میں منہ کے ذائقے کو ترس گیا تھا۔ الحمدللہ! میں اب تھوڑا تھوڑا کر کے کھا بھی لیتا ہوں اور چل پھر بھی سکتا ہوں''۔ چوہدری صاحب میٹنگ کے بعد اٹھے اور مہمان کو دروازے تک چھوڑ کر آئے اور وہ اس سے بے انتہا خوش تھے۔

آصف علی زرداری

مجھے اسی طرح ملک کے ایک اور نامور سیاست دان نے بتایا کہ آصف علی زرداری نے انھیں کھانے کی دعوت دی۔ یہ دعوت پر پہنچے تو ٹیبل پر درجنوں کھانے لگے تھے۔

ان کے بقول مَیں نے اپنی پلیٹ اٹھائی تو زرداری صاحب کا سیکریٹری آیا اور ان کا کھانا ان کے سامنے رکھ دیا۔ چھوٹی چھوٹی کولیوں میں تھوڑی سی بھنڈی، دال، ابلے ہوئے چاول اور آدھی چپاتی تھی۔ زرداری صاحب نے چند لقمے لیے اور خانساماں ٹرے اٹھا کر لے گیا۔ مَیں نے ان سے ان کی سادہ خوراک کے بارے میں پوچھا تو وہ ہنس کر بولے ''میری خوراک بس بھنڈی اور سادہ چاول تک محدود ہے، مَیں ان کے علاوہ کچھ نہیں کھا سکتا''۔ مَیں نے پوچھا ''کیا آپ گوشت نہیں کھاتے'' وہ دوبارہ ہنسے اور بولے ''میں گوشت کھا ہی نہیں سکتا''۔ میرا بہت دل چاہا مَیں ان سے وجہ پوچھوں لیکن احترام کی وجہ سے خاموش رہا۔ مَیں کھانا کھا کر واپس آ گیا لیکن آپ یقین کریں میں اس کے بعد جب بھی کھانا کھانے لگتا ہوں تو مجھے زرداری صاحب کی ٹرے یاد آ جاتی ہے اور میں کھانا بھول جاتا ہوں۔

ایک بینک مالک

میں بے شمار ایسے لوگوں سے واقف ہوں جنھیں اللہ تعالیٰ نے اقتدار، شہرت اور پیسے سے نوازا۔ ان کی ''ہاں'' سے سیکڑوں لوگوں کی زندگیاں بدل جاتی ہیں اور ''نہ'' سیکڑوں ہزاروں لوگوں کے قدموں سے زمین کھینچ لیتی ہے لیکن یہ خود اپنی قمیص پہن سکتے ہیں اور نہ اتار سکتے ہیں۔ یہ جھک کر اپنا جوتا بھی نہیں پہن سکتے۔ مَیں بینک کے ایک مالک کو جانتا ہوں۔ یہ صبح جاگتا ہے تو چار بندے ایک گھنٹہ لگا کر اسے بیڈ سے اٹھنے کے قابل بناتے ہیں۔ یہ اس کے پٹھوں کا مساج کر کے انہیں اس قابل بناتے ہیں کہ یہ اس کے جسم کو حرکت دے سکیں۔

اس کی گاڑی کی سیٹ بھی مساج چیئر ہے۔ یہ سفر کے دوران اسے ہلکا ہلکا دباتی رہتی ہے اوران کے دفتر اور گھر دونوں جگہوں پر ایمبولینس ہر وقت تیار کھڑی رہتی ہے۔ آپ دولت اور اثر ورسوخ دیکھیں تو آپ رشک پر مجبور ہو جائیں گے اور آپ اگر اس کی حالت دیکھیں تو آپ دو دو گھنٹے توبہ کرتے رہیں۔

صدرالدین ہاشوانی (ہوٹلوں کے مالک)

پاکستان میں ہوٹلز اور موٹلز کے ایک ٹائی کون ہیں: صدرالدین ہاشوانی۔ یہ پانچ چھ برسوں سے شدید علیل ہیں۔ ڈاکٹر اور فزیوتھراپسٹ دونوں ہر وقت ان کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کے پرائیویٹ جہاز میں ان کے ساتھ سفر کرتے ہیں۔ فزیوتھراپسٹ دنیا جہاں سے ان کے لیے فزیو تھراپی کی مشینیں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ مجھے جرمنی کے شہر باڈن جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ مساج اور دیسی غسل کا ٹاؤن ہے۔ شہر میں مساج کے دوسو سال پرانے سینٹر ہیں اور دنیا جہان سے امیر لوگ مالش کرانے کے لیے وہاں جاتے ہیں۔ چھ چھ ماہ بکنگ نہیں ملتی۔ آپ وہاں لوگوں کی حالت دیکھیں تو آپ کی نیند اڑ جائے گی۔ مریض کے پروفائل میں دس دس بلین ڈالر کی کمپنی ہوتی ہے لیکن حالت دیکھیں گے تو وہ سیدھا کھڑا ہونے کے قابل بھی نہیں ہوتا۔ ہم انسان ایک نس کھچ جانے کے بعد اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں رہتے۔ ہم چمچ تک نہیں اٹھا پاتے اور نگلنے کے قابل نہیں رہتے۔ یہ ہماری اصل اوقات ہے۔

مَیں ایک بہت ہی عام انسان ہوں میری اچیومنٹس نہ ہونے کے برابر ہیں لیکن چند دن قبل میرے ساتھ بھی ایک واقع ایسا پیش آیا جس نے مجھے اندر سے ہلا کر رکھ دیا۔ میں ۲۲ سال سے مسلسل واک کر رہا ہوں۔ میرے لیے دس پندرہ کلومیٹر عام سی بات ہوتی تھی، میں خود کو ''سپر فٹ'' بھی سمجھتا تھا، خوراک انتہائی کم تھی اور دماغ پر سکون۔ لائف اسٹائل پیس فل اور دن میں دو بار ایکسرسائز اور رات کے وقت واک۔ لیکن پھر ایک دن چلتے چلتے میرے گھٹنے نے میرا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا۔ ٹانگ میں شدید درد ہوا اور مَیں چلنے پھرنے سے تقریباً لاچار ہو گیا۔

اللہ کا کرم اور رحم ہے فزیوتھراپی کی وجہ سے مَیں اب نارمل ٹریک پر واپس آ رہا ہوں لیکن یہ واقعہ مجھے میری اوقات سمجھا گیا۔ مجھے چند منٹوں میں پتا چل گیا کہ اللہ کے اس سسٹم میں میری فِٹ نس اور احتیاط دونوں بے معنی ہیں۔

اسلام اور پاکستان مدیر

گھریلو تشدد بل۔ہم غافل لوگ

* پاکستان میں ''گھریلو تشدد سے عورتوں کی حفاظت'' کا قانون سب سے پہلے سندھ اسمبلی نے مارچ ۲۰۱۳ء میں پاس کیا۔ ۲۰۱۴ء میں یہی قانون بلوچستان اسمبلی نے پاس کیا۔ پنجاب اسمبلی سے یہ قانون ۲۰۱۶ء میں منظور کرایا گیا۔ خیبر پختون خواہ اسمبلی نے یہ قانون جنوری ۲۰۲۱ء میں پاس کیا۔ جولائی ۲۰۲۰ء میں یہ قانون قومی اسمبلی سے پاس کرایا گیا اور جون ۲۰۲۱ء میں سینٹ سے پاس ہوا۔

اس پر مختصر تبصرہ

* جب ۲۰۱۳ء میں یہ بل سندھ اسمبلی نے پاس کیا تو مغربی این جی او CEDAW کی ساؤتھ ایشیا برانچ نے خوشی اور فخر کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ بل عورت فاؤنڈیشن اور دیگر این جی اوز، لبرل وکلاء اور ارکانِ اسمبلی وغیرہ کی پانچ سالہ جدوجہد کا نتیجہ ہے۔

* جب ۲۰۱۶ء میں پنجاب اسمبلی سے یہ قانون پاس ہوا تو دینی قوتوں نے اس کے خلاف تحریک چلانے کی کوشش کی جس میں ملی مجلس شرعی کی طرف سے راقم الحروف بھی بعض اجلاسوں میں شریک رہا۔ پنجاب اور مرکز میں اس وقت ن لیگ کی حکومت تھی اور مولانا فضل الرحمن اور پروفیسر ساجد میر صاحب حکومت میں شامل اور اس کے حامی تھے لہٰذا تحریک نہ چل سکی۔

* سندھ اسمبلی میں جب یہ قانون پاس ہوا تو پیپلز پارٹی کی حکومت تھی۔ پنجاب میں جب یہ قانون بنا تو مسلم لیگ ن کی حکومت تھی۔ خیبر پختون خواہ اور مرکز میں یہ قانون پاس ہوا تو پی ٹی آئی کی حکومت تھی اور ہے۔ گویا ملک کی تینوں بڑی جماعتیں مغربی حمایت سے ہونے والی غیر اسلامی قانون سازی پر متفق تھیں اور آج بھی متفق ہیں۔

* پاکستان کی دینی قوتیں (سیاسی اور غیر سیاسی) اور علماء کرام کہاں ہیں؟ کیا ان میں اتحاد ہے؟ کیا وہ جاگ رہی ہیں؟ جب اسمبلیوں میں یہ قانون سازی ہو رہی تھی تو دینی سیاسی جماعتوں کے ارکان اسمبلی کہاں تھے؟ کیا وہ سو رہے تھے؟ نوجوان متحرک صحافی عاصم حفیظ صاحب نے یہ مسئلہ سوشل میڈیا میں اٹھایا تو یوں لگا جیسے کوئی نئی قانون سازی اچانک ہوئی ہے حالانکہ اسلام دشمن قوتیں تو برسوں سے اس پر کام کر رہی ہیں اور وہ بھی ایک تسلسل کے ساتھ۔ صرف علماء کرام اور دینی قوتیں ہی سوئی ہوئی ہیں۔

پاکستانیات　　مدیر

'گھریلو تشدد بل' کی اساس مغرب کی الحادی تہذیب ہے

مغرب کے "انسانی حقوق" اور "آزادی" کے تصورات اس قانون کی فکری بنیاد ہیں جو اپنی اصل میں غیر اسلامی ہیں لیکن نہ ہمارے حکمرانوں کو اس کا احساس ہے اور نہ ہماری سیاسی جماعتوں اور مغربی تعلیم یافتہ لوگوں کو

* یہ بات کہ والدین اپنے بچوں کی تربیت و تادیب کا حق نہیں رکھتے، خاوند بیوی کی اصلاح نہیں کر سکتا۔ عورت اور مرد کے حقوق ہر لحاظ سے مساوی ہیں اور یہ کہ بچوں اور بیوی کی تعلیم و تادیب کی کوشش قابل سزا جرم ہے۔ بیوی خاوند کو اور اولاد والدین کو معمولی باز پرس پر جیل بھجوا سکتی ہے۔ یہ باتیں اور ان پر مبنی قانون نیا نہیں ہے۔ مغربی قومیں اس طرح کے قوانین 'Women Empowerment' (حقوق نسواں)، Gender Equality (صنفی مساوات) اور Human Rights (بنیادی انسانی حقوق) کے نام پر عرصہ ہوا بنا چکی ہیں اور اب دوسری اقوام میں ان کے نفاذ کے لیے کوشاں ہیں چنانچہ یہ قانون دنیا کے اکثر ممالک میں نافذ ہو چکا ہے بلکہ پاکستان کے چاروں صوبوں کی اسمبلیاں بھی اس قانون کو منظور کر چکی ہیں۔

* مغرب اس طرح کے قوانین اگر اپنے معاشرے کے لیے بناتا ہے تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں، اگرچہ ہم ایسے قوانین کو انسانوں کے لیے غیر مناسب اور غیر مفید سمجھتے ہیں لیکن اگر مغرب خدا، وحی، کتاب اور اللہ کی ہدایت کو رد کرتا ہے اور انسانی عقل، تجربے اور خواہشِ نفس کو معیارِ حق سمجھتا ہے تو وہ خود اس حماقت کا ذمہ دار ہے اور اپنے لیے ایسے قوانین بنا سکتا ہے۔ لیکن اہل مغرب کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ وہ اپنی فکر، اپنی تہذیب اور اپنی معاشرت ان معاشروں اور ملکوں پر مسلط کرے جو اللہ کی ہدایت اور اس کے دین پر یقین رکھتے ہیں اور اپنی عقل و رائے کی بجائے خدا، وحی اور کتاب کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ خود کو آزاد اور خود مختار کی بجائے اللہ کا عبد اور حقیر بندہ سمجھتے ہیں اور یہ تسلیم کرتے ہیں کہ والدین اور اولاد اور اسی طرح خاوند اور بیوی کے لیے وہی حقوق و واجبات موزوں و مناسب ہیں جو اللہ نے مقرر کیے ہیں اور وہ اس میں اپنی رائے اور اپنی خواہش نفس پر نہیں چلنا چاہتے۔

* چنانچہ عورتوں (اور بچوں) کے حقوق کے نام پر مغرب اپنی فکر، اپنی تہذیب اور اپنی

معاشرت کی یونیورسلائزیشن کی جو کوششیں کئی برسوں سے کر رہا ہے اور انہیں اپنی سیاسی، معاشی، حربی اور ثقافتی بالادستی کے ذریعے دوسری قوموں خصوصاً مسلمانوں پر زبردستی مسلط کر رہا ہے، اس کا کوئی اخلاقی اور قانونی جواز نہیں ہے۔ مغرب قاہرہ، بیجنگ، میکسیکو، کوپن ہیگن اور نیروبی وغیرہ میں اس طرح کی بین الاقوامی کانفرنسیں اقوام متحدہ اور اس کے اداروں کے تحت عرصے سے منعقد کرتا چلا آ رہا ہے۔ وہ دوارب مسلم آبادی کو جو دنیا کی ایک چوتھائی سے بھی زیادہ ہے، اور اس کے عقائد اور طرز زندگی کو بُل ڈوز کر رہا ہے۔ سلامتی کونسل میں مسلم ممالک کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ کمزور سیاسی اور معاشی پوزیشن کی وجہ سے مسلمانوں کو غیر اسلامی بین الاقوامی قوانین اور معاہدوں کو تسلیم کرنے اور ان پر عمل درآمد کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ یہ انصاف اور عدل کے مسلمہ بین الاقوامی اصولوں کے خلاف ہے۔ مغرب ان اصول واقدار کو آفاقی قدریں قرار دیتا ہے جبکہ وہ ہرگز آفاقی قدریں نہیں ہیں بلکہ صرف مغربی تہذیب کی اقدار ہیں جو ان کی مخصوص آئیڈیالوجی اور ورلڈ ویو کی پیداوار ہیں، خدا و مذہب کی مخالفت پر مبنی ہیں اور دنیا کے دوارب مسلمانوں کے اصول واقدار اور ان کی تہذیب ومعاشرت کی نفی کرتی ہیں۔

* حقیقت یہ ہے کہ مغربی تہذیب دینِ کفر ہے، دینِ غیر اللہ ہے۔ یہ محض معاشرت، ثقافت اور رسوم کے تنوع اور اختلاف کا معاملہ نہیں بنیادی عقاید اور طرز حیات (دین) کے تضاد کا معاملہ ہے۔ اسلام میں اس 'آزادی' کا کوئی تصور نہیں جو مغرب کی بنیادی قدر ہے۔ مغرب میں انسان ہیومنزم، لبرلزم اور فریڈم یعنی تصور 'آزادی' کی رو سے مادر پدر آزاد ہے، خود مختار ہے بلکہ مختارِ مطلق ہے۔ حق وہ ہے جو وہ سوچے، جو وہ کرنا چاہے، جو اس کی مرضی ہو، جو اس کی خواہش ہو۔ وہ کسی خدا کا عبد نہیں ہے، کسی خدا کی اطاعت کو وہ واجب نہیں سمجھتا اور خود کو اس کا مکلف نہیں سمجھتا۔ ایسے 'تصورِ انسان' کو مسلمان کس طرح قبول کر سکتے ہیں جو خود کو خدا کا 'عبد' سمجھتے ہیں، اس کے ہر حکم کی پیروی کرنا چاہتے ہیں اور اللہ کے حکم کے مقابلے میں ہرگز اپنی مرضی نہیں کرنا چاہتے۔

* مغرب میں انسان کے 'حقوق' وہ ہیں جو خود مختار انسان (Human Being) خود طے کرتے ہیں چنانچہ مغرب نے جو بنیادی انسانی حقوق طے کیے ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ ہر انسان کو مذہب کو قبول کرنے یا اسے چھوڑنے کی آزادی ہے۔ مرد ہر مذہب کی عورت سے شادی کر سکتا ہے۔ عورت کے وہی حقوق ہیں جو مرد کے ہیں۔ وہ اپنی مرضی سے شادی کر سکتی ہے، اپنی

مرضی سے طلاق دے سکتی ہے۔ وراثت، گواہی اور ہر معاملے میں اس کے حقوق مرد کے مساوی ہیں۔ عورت اور مرد اپنی آزاد مرضی سے جب چاہیں جنسی تعلق قائم کر سکتے ہیں.... وغیرہ وغیرہ۔

* مغرب نے اپنی 'جمہوریت' کو تقدس عطا کر رکھا ہے حالانکہ وہ ہیومنزم، سیکولرزم، لبرلزم اور کیپٹل ازم جیسے منکر خدا و مذہب نظریات کی پیداوار ہے جن میں انسان اپنا خدا خود ہے۔ اس 'جمہوریت' میں انسان اپنی مرضی سے اپنی ریاست کا بنیادی قانونی ڈھانچہ (آئین) بناتے ہیں اور اس کے مطابق زندگی گزارتے ہیں اور ہر آئین کا اولین جزو 'بنیادی انسانی حقوق' ہوتے ہیں (آئین پاکستان میں بھی نام وغیرہ کے بعد اولین باب بنیادی انسانی حقوق کا ہے، اور یہ حقوق وہی ہیں جو مغرب کے انسان نے خود طے کیے ہیں)۔

* اس کے مقابلے میں اسلام میں کوئی ہیومنزم، سیکولرزم، لبرلزم، کیپٹل ازم نہیں ہے۔ مسلمان وہ ہے جو بلا شروط وحدود اللہ کے احکام کی پیروی کرے، اس کے آگے سر تسلیم خم کرے، اس کی مرضی کے آگے اپنی مرضی سے دست بردار ہو جائے۔ معاشرتی زندگی ہو یا سیاسی، انسانوں کے حقوق و واجبات کا تعین اللہ تعالیٰ کرتے ہیں، بندے خود نہیں کرتے اور جو حقوق و واجبات اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب (قرآن حکیم) میں طے کر دیے ہیں اور ان کی جو وضاحت اللہ کے بھیجے ہوئے پیغمبر ﷺ نے کی ہے، ان کی رو سے عورت اور مرد ہر معاملے میں مساوی نہیں ہیں، مرد عورت پر قوام ہے، والدین اولاد کی تربیت اور تادیب کے ذمہ دار ہیں۔ قرآن وسنت میں اللہ و رسول کی طرف سے دیے گئے حقوق و واجبات مغرب کے حقوق سے مختلف ہیں اور کئی جگہ متضاد ہیں لہٰذا مسلمانوں کے لیے ان پر عمل کرنا ممکن نہیں۔ یہ محض معاشرتی، ثقافتی اور قانونی مسئلہ نہیں، ان کے دین و ایمان کا مسئلہ ہے۔ مسلمان اپنے عقیدے اور ایمان کی رو سے اللہ و رسول کی دی ہوئی تعلیمات پر عمل کے پابند ہیں، ان کے مکلف ہیں۔ وہ ان کی خلاف ورزی کا سوچ بھی نہیں سکتے۔

* لہٰذا حقوقِ نسواں اور گھریلو تشدد سے بچنے کے مغربی قوانین خلافِ اسلام ہیں اور مسلمان ان کو ہرگز قبول نہیں کر سکتے لیکن ہمارے حکمران اور سیاستدان مغرب زدہ ہیں۔ وہ مغربی فکر و تہذیب کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اسلامی شریعت پر عمل نہیں کرتے، اسے ملک میں نافذ نہیں کرتے اور اس پر عمل نہیں کرتے اور کرواتے۔ پاکستان کے مسلمانوں اور دینی قوتوں کے

لیے اب ایک ہی راستہ بچا ہے کہ وہ مغرب کی لادین فکر و تہذیب اور اس کے غیر اسلامی قوانین کی مزاحمت کریں۔ اس کے خلاف پر امن جدوجہد کا ہر راستہ اپنائیں، عوامی تحریک کے ذریعے، عدالتوں کے ذریعے، پارلیمنٹ کے ذریعے، میڈیا کے ذریعے، مساجد کے پلیٹ فارم سے، سیمینارز اور کانفرنسوں کے ذریعے، ریلیاں نکال کر.... غرض ہر پر امن ذریعہ استعمال کریں لیکن مغرب کے لانچ کیے ہوئے غیر اسلامی قوانین کو قبول نہ کریں۔

* حال ہی میں ترکی کے صدر اردوان نے گھریلو تشدد اور حقوق نسواں سے متعلق قانون کو منسوخ کر کے ایک جرأت مندانہ قدم اٹھایا ہے۔ مسلم حکمرانوں کو چاہیے کہ وہ متحد ہو کر مغربی ممالک اور اقوام متحدہ (جوان کے گھر کی لونڈی ہے) کے غیر اسلامی قوانین اور معاہدوں کو رڈ کر دیں اور جن قوانین و معاہدوں پر وہ رواروی اور دباؤ میں آ کر دستخط کر چکے ہیں ان سے دست برداری کا اعلان کر دیں۔ یہی ان کی اسلامی شناخت، ملی بقا اور دینی غیرت کا تقاضا ہے۔ پاکستانی حکمرانوں کو بھی چاہیے کہ وہ اس قانون کو رڈ کر دیں یا کم از کم اس پر خاموشی ہی اختیار کر لیں۔

لبرل مہربان کا گلہ

ایک لبرل ماہر افغان امور نے دینی طبقات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ انہیں اپنے ہاں جمہوریت چاہیے اور افغانستان میں طالبان کی غیر جمہوری حکومت کی تائید و حمایت کر رہے ہیں۔

ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ اشرف غنی کی حکومت بھی امریکہ کی مسلط کردہ ہے اور آپ اس کے حامی ہیں۔ ہم کسی دوسرے ملک کے نظامِ حکومت کا فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہیں؟ چین ہمارا سب سے قابل اعتماد دوست ہے، کبھی ہم ان کے نظام کو زیر بحث لائے ہیں؟ شرقِ اوسط میں ملوک وسلاطین اور آمر ہیں، کبھی ہم ان کے نظام کو زیر بحث لائے ہیں؟ امریکہ کو جب مختلف ادوار میں پاکستان کے فوجی حکمرانوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی ضرورت پڑی، تو کیا اس نے یہ دیکھ کر رُخ پھیر لیا کہ یہاں جمہوریت نہیں ہے؟ بس لبرلز کو دینی طبقات کو کوسنے کے لیے کوئی بہانہ چاہیے۔

(مفتی منیب الرحمٰن)

اسلام اور پاکستان عاصم حفیظ

مغرب پاکستان میں غیر اسلامی قانون سازی کیسے کراتا ہے؟

کیا پاکستان کی دینی قوتیں غور فرمائیں گی؟

ارض پاک میں بڑی تیزی سے ایسی قانون سازی سامنے آ رہی ہے جس نے معاشرے کی ہیئت تبدیل کرنے کا کام کیا۔ دینی و سنجیدہ حلقے چکرا کر رہ گئے ہیں۔ ایک قانون کے اثرات سمجھتے ہیں، اس کے مندرجات آشکار ہوتے ہیں تو اسی دوران اس سے بھی بڑھ کر قانون سازی سامنے آ چکی ہوتی ہے۔ مدارس بورڈ ورجسٹریشن، ایف اے ٹی ایف، وقف املاک بورڈ، گھریلو تشدد، اقلیتی بل سمیت کئی ایسے قوانین تیزی سے منظور ہوئے ہیں کہ جن کے مندرجات دیکھ کر آپ حیران و پریشاں رہ جائیں۔ کس طرح ملکی تشخص، معاشرتی روایات، خاندانی نظام، دینی روایات، نظام تعلیم اور معاشی نظام کو یکسر بدل کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس کے اثرات آپ معاشرے میں دیکھ سکتے ہیں اور آنے والے دنوں میں یہ قانونی شکنجے اس قدر سخت ہو جائیں گے کہ ہوش اڑا کے رکھ دیں گے۔ ایسی قانون سازی پلان کون کرتا ہے؟ کون سے ذہن کام کرتے ہیں؟ منصوبہ کس کا ہوتا ہے؟ الفاظ کے چناؤ سے قانونی پیچیدگیوں تک سب مراحل کہاں طے ہوتے ہیں؟ اس سسٹم کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

میرے ایک دوست جو انٹرنیشنل ریلیشنز میں ماسٹرز تھے۔ ہم اکٹھے ایک ادارے میں تھے۔ ایک دن بتانے لگے کہ ان کی ایک انٹرنیشنل این جی او میں جاب ہو گئی ہے۔ ڈیوٹی پارلیمنٹ میں لگی ہے۔ تھوڑا تجسس تھا۔ پوچھنے پر بتایا کہ ان کی این جی او نے درجنوں قانون، انٹرنیشنل ریلیشنز، سوشیالوجی اور دیگر مضامین کے گریجوایٹ بھرتی کیے ہیں۔ ان کی ڈیوٹی ارکان اسمبلی، وزراء اور سینیٹرز کے ساتھ لگائی گئی۔ یہ این جی اوز کے نمائندے ارکان اسمبلی کو قانون سازی، دفتری امور اور دستاویزات کی تیاری میں مدد دیں گے۔ تنخواہیں این جی او دے گی اور ڈیوٹی پارلیمنٹ میں ارکان کے ساتھ۔ آپ ذرا تصور کریں کہ ارکان پارلیمنٹ کو مفت سروسز دی جا رہی ہیں۔ ان کی مدد و معاونت کے لیے 'رضا کار' فراہم کر دیئے گئے۔ ارکان اسمبلی خوش ہوتے ہیں کہ انہیں

مفت کے ملازمین مل گئے ۔ ان کی دستاویزات ،تقاریر ، قانون سازی پر رائے ،خطوط کے جوابات ،دفتری امور یہ سرانجام دیتے ہیں ۔ارکان اسمبلی کی اکثریت زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہوتی ۔ جاگیردار وڈیرے اور بزنس مین ہوتے ہیں ۔حلقوں میں مصروف رہتے ہیں ۔ٹھیکے اور ترقیاتی کاموں کے لیے فنڈز کے حصول میں مگن ۔ان کی قانون سازی کے متعلق ضروریات یہ این جی اوز کے فراہم کردہ 'رضا کار' پوری کر رہے ہوتے ہیں۔

اب ایک دوسری صورت حال سمجھیں ۔مغربی تھنک ٹینک اپنی حکومتوں کو مکمل رہنمائی دیتے ہیں کہ کس طرح اپنے نظریات اور سیکولر و لبرل طرز زندگی کو دیگر ممالک خصوصاً اسلامی ممالک میں نافذ کرنا ہے ۔کس طرح لابنگ کرنی اور قانون سازی میں مشاورت مہیا کرنی ہے ۔انھی کی رہنمائی میں مغربی حکومتیں اپنے متعلقہ سرکاری وغیر سرکاری اداروں اور این جی اوز کو ہدایات دیتی ہیں ۔اب وہاں پر فنڈز اکٹھے ہوتے ہیں کہ ان مقاصد کے لیے اتنے فنڈز رکھے جائیں گے ۔ اسلامی ممالک میں سرگرم مقامی این جی اوز کو یہ فنڈز درکار ہوتے ہیں ۔وہ ورکنگ پیپر پیش کر کے فنڈنگ لیتے ہیں ۔ یہ اپنی ورکنگ اور پلاننگ پیش کرتے ہیں کہ ہم کس طرح اپنے اپنے ممالک میں اثر ورسوخ رکھتے ہیں ۔کن بااثر شخصیات کے ساتھ تعلق ہے اور اگر انہیں پراجیکٹ دیا جائے تو وہ کس طرح یہ قانون سازی کروالیں گے ۔جب ایک مخصوص ایجنڈا بن جاتا ہے تو اس کے حوالے سے کئی این جی اوز کو ٹاسک ملتے ہیں ۔مثلاً عورت مارچ کی صورت میں ریلیاں کرانا، مخصوص نعرے سامنے لانا، پوسٹرز کے ذریعے پیغام دینا ایک این جی او کا کام ہوگا ۔ان ریلیوں کو میڈیا پر ہائی لائٹ کرنا، ٹاک شوز کا موضوع بنا دینا، ارکان اسمبلی اور اہم شخصیات کو اس حوالے سے مدعو کرنا کسی اور کا ۔اسے ایک بڑا ایشو بنا کر پیش کر دیا جاتا ہے ۔اس حوالے سے ڈراموں، فلموں اور ڈاکومنٹری کے موضوعات پر ویڈیوز سامنے آتی ہیں ۔گھریلو تشدد جیسے قوانین راتوں رات پاس نہیں ہوتے ۔فلموں، ڈراموں کے ذریعے ذہن سازی کی جاتی ہے ۔اگر یقین نہ آئے تو ان دنوں پاکستانی ڈراموں میں محرم رشتوں ،طلاق ،کئی کئی عورتوں سے تعلقات کے موضوعات دیکھ لیں ۔ ہر ہر مرحلے پر فنڈنگ ہوتی ہے ۔ملٹی نیشنل کمپنیوں کے اشتہارات ،اینکرز ،صحافیوں اور میڈیا مالکان کے لیے مراعات ہوتی ہیں ۔میڈیا ہاؤسز کو فنڈز ملتے ہیں ۔حدود آرڈیننس کے وقت 'ذرا سوچیے!' اور دیگر میڈیا مہمیں آپ کو یاد ہوں گی ۔

معاشرے میں ڈسکشن کے بعد اب مرحلہ آتا ہے قانون سازی کا۔ ارکان اسمبلی کو ان کے رضا کاروں کے ذریعے جو کہ قانون سازی میں معاونت کے لیے پہلے ہی وہاں موجود ہوتے ہیں ۔ انہیں ماہرین قانون کا تیار کردہ ڈرافٹ فراہم کر دیا جاتا ہے۔ آپ کبھی پارلیمنٹ کی کارروائی دیکھیں، قائمہ کمیٹیوں کے اجلاس میں جائیں، آپ کے ہوش اڑ جائیں گے کہ قانون سازی کے عمل میں کس طرح این جی اوز کے نمائندے باقاعدہ اجلاسوں میں شرکت کرتے ہیں۔ عورت فاؤنڈیشن، یوتھ پارلیمنٹ اور مختلف قسم کے حقوق کے نام پر بنی این جی اوز کے نمائندے ان قائمہ کمیٹیوں میں قانونی دستاویزات تیار کراتے ہیں۔ انہی کے رضا کار ارکان اسمبلی کی جانب سے سفارشات شامل کراتے ہیں۔ ارکان اسمبلی کو قائل کرتے ہیں۔ اس حوالے سے سیمینارز اور میٹنگز کے اخراجات یہ این جی اوز اٹھاتی ہیں۔ ہم خیال ارکان اسمبلی کے گروپ کے ذریعے پارٹی حمایت لی جاتی ہے۔ کیا یہ حیرانی کی بات نہیں کہ ایسے قوانین کو اپوزیشن اور حکومتی ارکان کی یکساں حمایت ملتی ہے حالانکہ عموماً یہ ہر قانون پر ایک دوسرے کی مخالفت کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر کہیں مشکل پیش آ رہی ہو تو مغربی ممالک کے سفارت خانے اور اقوام متحدہ کے ادارے ایمنسٹی انٹرنیشنل اور دیگر تک کے عہدیدار ایکٹو ہوتے ہیں۔ پیغام دیا جاتا ہے کہ یہ اور یہ قوانین بنانا کس قدر ضروری ہے۔ عالمی پابندیوں سے ڈرایا جاتا ہے۔ ہر سال حقوق انسانی کی رپورٹ نشر ہوتی ہے، اس میں تذکرہ ہوتا ہے۔ ایف اے ٹی ایف کی گرے، وائٹ اور دیگر لسٹوں کا پریشر ہوتا ہے۔ اور اس طرح ایک بل قانون کا حصہ بنا دیا جاتا ہے۔ اس دوران مغربی ممالک سے آنے والے وفود بھی اس بارے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں اور اعلی حکومتی عہدیداروں تک اپنی آراء پہنچاتے ہیں۔

آپ غور کریں کہ اس سارے پراسیس میں دینی جماعتیں اور دینی جذبہ رکھنے والے احباب کہاں کھڑے ہیں؟ وہ تعلیم و تبلیغ میں مصروف ہیں۔ انہیں کیا پتہ قانون سازی کی راہداریوں میں کیا ہو رہا ہے؟ وہ تو دینی تعلیم کے شاندار ادارے بنا رہے ہوتے ہیں اور پتہ چلتا ہے کہ ایک قانون وقف املاک اور مدارس رجسٹریشن کا آتا ہے جو سارے نظام کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔

کیا کبھی دینی جماعتوں نے اور ان غیر اسلامی و غیر شرعی قوانین کے بارے میں غصہ کرنے والے اصحاب خیر نے غور کیا ہے کہ انہیں بھی کوئی تھنک ٹینک بنانا چاہیے؟ کیا وہ بھی قانون ،

انٹرنیشنل ریلیشنز، سوشیالوجی کے کچھ ماہرین اپنے خرچے پر اپنی ہی دینی جماعتوں کے ارکان اسمبلی کوفراہم کر سکتے ہیں؟ کیا ملک کے سارے دینی حلقے مل کردس پندرہ ایسے ماہرین بھرتی کر سکتی ہیں جو قائمہ کمیٹی اجلاسوں میں شرکت کریں، قانون سازی کے پراسیس کو دیکھیں، اس کے مندرجات کو پڑھیں، غور کریں اور دینی ارکان اسمبلی کو بروقت آگاہ کریں۔ دینی جذبہ رکھنے والے مختلف پارٹیوں کے ارکان پارلیمنٹ کو آگاہ وقائل کرنے کے لیے میٹنگز کرائی جائیں۔ یقین مانیں قانونی زبان اور پیچیدگیاں اس قدر ہوتی ہیں کہ دینی ارکان اسمبلی انہیں سمجھ ہی نہیں پاتے۔ بعض اوقات تو اس وقت پارلیمنٹ میں حاضر بھی نہیں ہوتے۔ جب قانون پاس ہوجاتا ہے پھر سب پریشان ہوتے ہیں، غصہ کرتے ہیں۔ شور ہوتا ہے، واویلا مچایا جاتا ہے لیکن قانون تو بن چکا ہوتا ہے۔ وہ برقرار رہتا ہے، بدلتا نہیں ہے۔

دینی حلقوں کو سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ پراسیس کو سمجھیں۔ ماہرین کی خدمات لیں۔ جب ڈرافٹ تیار ہو رہے ہوں، دستاویزات تیار کی جارہی ہوں اور قائمہ کمیٹیوں میں بحث چل رہی ہو تو اس وقت اپنا فیڈ بیک دیں۔ دینی ارکان اسمبلی بذات خود تو ہر اجلاس کا، ہر قائمہ کمیٹی کا، ہر میٹنگ کا حصہ نہیں بن سکتے۔ اس کے لیے تو ایک متحرک ٹیم چاہیے جو انہیں آگاہ رکھے۔ کہاں کون سی قانون سازی ہو رہی ہے؟ خصوصاً معاشرتی، سماجی اور دینی معاملات سے متعلق قانون سازی پر نظر رکھی جائے، اس کے ڈرافٹ کو سمجھا جائے اور بروقت موزوں حکمت عملی اپنائی جائے۔ احتجاج، انتباہ، بیانات، غصہ اور اظہار افسوس اگر بروقت کرلیا جائے تو اس کا فائدہ ہوسکتا ہے اور کئی غیر اسلامی و غیر شرعی بل، معاشرتی و خاندانی نظام کی ہیئت تبدیل کردینے والے قوانین بننے سے پہلے بھی روکے جاسکتے ہیں۔

اہل خیر آگے بڑھیں۔ جس طرح تعلیم وتبلیغ کے اخراجات سے ثواب دارین ملتا ہے اسی طرح شریعت، معاشرے، خاندانی نظام حتی کہ مدارس ومساجد کا نظام بچانے کے لیے اس شعبے میں متحرک ہونے کی ضرورت ہے۔ یہ بھی ثواب کا کام ہے۔ اگر اس بارے میں سنجیدگی نہ دکھائی گئی تو بہت جلد یہ آپ کے خاندان، آپ کے گھرانے، آپ کے دینی ادارے، آپ کی سماجی روایات اور آپ کے طرز زندگی کو متاثر کرے گا، بدل کر رکھ دے گا۔ اگر آپ قانون سازی کے شعبے میں کوئی سرمایہ کاری نہیں کریں گے، کچھ بوئیں گے ہی نہیں تو کل جب آپ کو اپنی دینی

روایات اور مدارس و مساجد کا نظام بچانے کے لیے قانون کی مدد درکار ہوگی تو آپ کچھ کاٹ نہیں سکیں گے، صرف ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔فتوے، غصہ بھری پوسٹیں، احتجاج، ریلیاں اور تقریریں کرنے سے پہلے اپنے حصے کا یہ کام کرنے کے بارے میں بھی ضرور سوچیں۔

فرمان نبوی ہے کہ جو بویا جائے وہی کاٹا جاتا ہے۔آپ کے لیے وہی کچھ ہے جس کے لئے آپ نے کوشش کی۔اگر کچھ سرگرمی ہی نہیں تو بہتری کی امید کیسی؟ اگر آپ یہ سوچ کر بیٹھے ہیں کہ جاگیردار، وڈیرے، سرمایہ دار ارکان پارلیمنٹ این جی اوز کے رضا کاروں کے زیر اثر ایسی قانون سازی کریں گے جو دینی روایات کی امین ہوگی تو اسے صرف معصومیت ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔یہ دنیا ایک میدان ہے۔جو کوشش کرے گا، سرگرمی دکھائے گا اسے کچھ نہ کچھ حاصل بھی ہو جائے گا۔جب کچھ شروع ہی نہیں کیا، کچھ بویا ہی نہیں تو کاٹنے اور پھل کی کیا امید ہے؟

قربانی اور شیطان

شیطان کو اس کا بڑا درد تھا کہ کہیں چھری اسماعیل کے گلے پر نہ پھر جائے۔وہ ہر طور اس عمل کو روکنے کے درپے تھا، بھاگا پھرتا تھا، کبھی باپ کے پاس جاتا، کبھی بیٹے کو ورغلاتا اور کبھی اس کی ماں کو۔

بھلا کیوں؟ کیا اسے واقعی اسماعیل کی جان عزیز تھی؟ اور وہ واقعی اسماعیل کو بچانا چاہتا تھا؟ نہیں بلکہ وہ چاہتا تھا، کہ کہیں حکم ربی کی تعمیل کر کے سیدنا ابراہیم اطاعت الٰہی کا وہ مقام نہ پالیں، جسے ٹھکرا کر خود شیطان راندۂ درگاہ ہوا تھا۔

آج بھی قربانی سے روکنے والے، جانوروں کا درد محسوس کرنے والے کئی لوگ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلّا رہے ہیں۔دراصل ان کے وجود میں چلاتے شیطان کو درد جانوروں کا نہیں، درد اطاعت الٰہی کے نتیجے میں ملنے والے اس اعزاز اور ثواب کا ہے، جو قربانی کرنے والے پالیں گے۔

بے وقوف سمجھتا نہیں کہ جب محبت الٰہی میں باپ کو بیٹے کے گلے پہ چھری پھیرنے سے نہ روک سکا تو حکم ربی کی تعمیل میں جانوروں کے گلے پر چھری پھرنے سے کیسے روک سکتا ہے؟ لیکن شیطان ہے نا، لگا رہے گا۔خیر! وہ نافرمانی میں لگا ہے، آپ فرمانبرداری میں لگے رہئے۔

اسلام اور پاکستان　　　　مولانا احتشام صدیقی

اجتماعی قربانی مقاصدِ شریعت کے خلاف ہے
علماء کرام کو اس کی مزحمت کرنی چاہیے

گزشتہ کئی برس سے اجتماعی قربانی کا سلسلہ جاری ہے۔ اس کی ابتداء کراچی میں ایک ضرورت کے تحت ہوئی جب ایم کیو ایم کی دہشت گردی کا نشانہ قربانی کے جانوروں کی کھالیں بنیں۔ لوگوں نے کھال چھیننے سے بچنے کے لیے مختلف اداروں سے رجوع کیا اور ایک ضرورت کے تحت اداروں کی زیر نگرانی یہ سلسلہ سکون سے جاری رہا۔ وہ اضطراری حالت اب ختم ہوگئی ہے لیکن اجتماعی قربانی کا عمل اداروں کی سرپرستی میں دوام حاصل کر چکا ہے جس کے مفاسد نہایت واضح ہیں۔ مسئلہ صرف کراچی تک محدود نہیں اب پورے ملک میں ہر سڑک پر اجتماعی قربانی کے اشتہار لگے ہوئے ہیں اور لوگوں کو اجتماعی قربانی کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ سوال یہ ہے:

۱۔ کیا قربانی کا حکم فرد کو یا گیا ہے یا اداروں کو؟

۲۔ اسلامی تاریخ میں عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر خلافت عثمانیہ تک اور اس کے بعد بھی سالوں تک لوگ ذاتی طور پر قربانی کرتے تھے۔ اجتماعی قربانی کی روایت وہاں نظر کیوں نہیں آتی؟

۳۔ قربانی کے سلسلے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جو احکام ہیں اُمت ان احکام پر قربانی کے ایام میں عمل کرتی تھی۔ قربانی سے متعلق تمام فقہی احکام بھی امت کو ازبر تھے کیونکہ لوگ خود قربانی کا جانور خریدتے تے، اس کی خریداری فقہ کے احکامات کے مطابق ہوتی، لوگ جانور کو پالتے۔ اس کی خدمت کرتے اور اس سے محبت پیدا کر کے اسے ذبح کرتے جو دین کو مطلوب عمل ہے۔ کیا اجتماعی قربانی کے نتیجے میں عام آدمی کو حاصل علم اور دین کو مطلوب عمل باقی رہنے کا کوئی امکان ہے؟

۴۔ لوگ جانور خود نہیں خریدیں گے، خود ذبح کرنے کے انتظامات نہیں کریں گے، خود اس کی خدمت نہیں کریں گے تو ان سنن اور نفلی احکام کا کیا ہوگا جن پر عمل فرد کی ذمہ داری ہے اداروں کی ذمہ داری نہیں؟

۵۔ قربانی کے جانوروں کے ذریعے لوگ شہروں کی غیر فطری زندگی میں فطرت سے تعلق قائم کرتے تھے بچوں میں اسلامی روایات، احکام، فقہ اسلامی کے اصول اس قربانی کے ذریعے

رہتے تھے لیکن جب قربانی کا کام اداروں نے سنبھال لیا تو قربانی کی سنت، اس کا علم، اس کی فقہ عوام کے حافظے سے خارج نہیں ہو جائے گی؟

۶۔ گائے کی قربانی میں سات حصے ہوتے ہیں لہٰذا ایک ہی محلے کے لوگ مل جل کر گائے کی خریداری کرتے تھے۔ اس عمل کے ذریعے وہ گائے کی کٹائی، گوشت کی تقسیم، حصہ داروں کے حقوق وغیرہ سے احکام دین کے ذریعے واقف ہو جاتے تھے۔ ان کے درمیان سماجی، معاشرتی روابط مضبوط ہوتے تھے، ایک دینی اجتماعیت پیدا ہوتی تھی۔ محلے والے اور ان کے بچے مل جل کر خریداری کے لیے منڈی جاتے، جانوروں کی تلاش کرتے جس سے آپس میں قریبی روابط پیدا ہوتے تھے اور علم فقہ بچوں میں عملی طور پر منتقل ہوتا تھا۔ کیا اجتماعی قربانی نے اس پورے عمل کو ختم نہیں کر دیا؟

یہ چند سوالات، خدشات، شبہات ہیں جو کئی سالوں سے مجھے پریشان کر رہے ہیں۔ ان پر کچھ علماء سے گفتگو بھی ہوئی لیکن کوئی واضح لائحہ عمل نہیں مل سکا۔ اب یہ سن رہے ہیں کہ مارکیٹ میں بڑی بڑی کمپنیاں آ رہی ہیں جو نہایت اعلیٰ طریقے سے گوشت کاٹیں گی، اسے سرد بند ڈبے میں محفوظ کریں گی، قربانی کے جانور کے ہر حصے کا گوشت الگ الگ خانوں میں رکھیں گی اور انہیں گھر بھی پہنچا دیں گی۔ کراچی اور لاہور میں کچھ کمپنیوں نے یہ کام شروع کر دیا ہے۔ یہ کام اگر بڑھا اور پھیلا تو اجتماعی قربانی کے اداروں اور مدارس سے یہ کام نکل کر ان کمپنیوں کے ہاتھوں میں چلا جائے گا۔ ان کی خدمات اور معیار جس درجے کا ہوگا ظاہر ہے وہ معیار اجتماعی قربانی کے ادارے مہیا نہیں کر سکتے اس کے نتیجے میں نقصان امت کو ہی پہنچے گا۔ کیا ہم اس وقت ان کمپنیوں کی مخالفت کر سکیں گے اور عوام کو یہ پیغام دینے کے قابل رہیں گے کہ قربانی کرنے کا حکم فرد کو دیا گیا ہے اداروں کو نہیں؟ وہ وقت اگر آ گیا تو امت کو کتنے بڑے خسارے کا سامنا ہوگا؟

الحمدللہ! تمام مکاتب فکر کے جید علماء کی جانب سے اجتماعی قربانی کی حمایت میں کوئی فتویٰ تو نہیں آیا لیکن اس مسئلے پر ان اکابرین کی خاموشی میری ناقص رائے میں مناسب نہیں ہے۔ امت کا تواتر، تعامل، اجماع حجت ہے لہٰذا امت صدیوں سے جس طرح قربانی کرتی آئی ہے اس سنت میں نئی روایت داخل کرنا کیا تواتر و اجماع سے انحراف نہیں ہوگا؟ اس دور میں قرآن و سنت پر عمل مسلسل کم ہو رہا ہے۔ لوگ صرف اور صرف مال و دولت کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ ایسے دور میں اگر علماء کرام اپنے عمل سے لوگوں کو سنت کے مطابق قربانی کرنے پر آمادہ کرنے کی بجائے لوگوں کو قربانی کے سنن و نوافل سے دور کرنے کا سبب بنیں تو کیا یہ قابل قبول صورت ہوگی؟

تفہیم مغرب　　　ڈاکٹر محمد امین

مغربی تہذیب دینِ کفر اور دینِ غیر اللہ ہے
مسلمانوں پر اس کا ردّ واجب اور اس کی پیروی حرام ہے

[اگر چہ راقم ایک سعودی یونیورسٹی سے فقہ و اصول فقہ میں ایم فل کی ڈگری رکھتا ہے لیکن نہ تو اس نے کبھی فتویٰ دیا ہے اور نہ کبھی فتوی کی زبان استعمال کی ہے بلکہ ہمیشہ دلیل سے اپنا مؤقف پیش کیا ہے لیکن ہمارے علماء کرام اور مغربی تہذیب یافتہ لوگوں کی اکثریت کو کیونکہ مغربی تہذیب کے تنقیدی مطالعے کا موقع نہیں ملا اس لیے ان کا مؤقف اس کے بارے میں بہت نرم ہے۔ ہمارے اس عنوان کو اختیار کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ان کو تنبیہ ہو اور وہ اس معاملے کی اہمیت اور نزاکت کو سمجھیں اور اس پر غور کریں۔ مدیر]

''دین'' عربی لفظ ہے جس کے لغوی معانی میں سے ایک بنیادی معنی راستے کے ہیں۔[۱] مطلب یہ کہ وہ راستہ جس پر چل کر زندگی گزاری جائے۔

''شریعت'' کا لفظ بھی تقریباً اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لغت میں اس کے معنی ہیں وہ راستہ جس پر چل کر جانور پانی پینے کے منبع (جوہڑ، جھیل، ندی، نالہ، دریا، سمندر وغیرہ) تک جاتے ہیں۔[۲] جانوروں کے پانی کے منبع تک بار بار جانے سے جو راستہ بن جاتا ہے اسے شارع کہتے ہیں (جیسے اردو میں کہتے ہیں کہ یہ شارع عام نہیں ہے، یا لاہور میں مال روڈ کا نام تبدیل کر کے شارع قائداعظم رکھ دیا گیا ہے) اور پانی پر چونکہ جانداروں کی زندگی کا مدار ہوتا ہے یعنی انہیں پانی نہ ملے تو وہ مر جاتے ہیں، زندہ نہیں رہ سکتے لہٰذا شریعت کا معنی ہوا ''شاہراہِ حیات'' یعنی وہ صحیح راستہ جس پر چلنا زندگی کی بقاء کی ضمانت ہے اور جس پر نہ چلنا گویا زندگی اور جینے کے خاتمے کا سبب ہے۔ خلاصہ یہ کہ لغوی لحاظ سے دین کے معنی ہیں راستہ، منہج، طریقہ۔ اسے طرزِ زندگی یا نظام حیات بھی کہا جا سکتا ہے۔ دین کا لفظ قرآن حکیم میں بکثرت استعمال ہوا ہے، دین اسلام کے

---

[۱] ابن منظور، لسان العرب، دار صادر بیروت، جلد ۱۳، صفحہ ۱۶۶

[۲] ابن منظور، لسان العرب، دار صادر بیروت، جلد ۸، صفحہ ۱۷۵

معنوں میں بھی اور دین ماسوا اللہ کے لیے بھی۔

دینِ اسلام

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اسلام کو 'دین' قرار دیتے ہوئے فرمایا "اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ"[1] یعنی دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔

اسلام سے کیا مراد ہے؟ اسلام کے لفظی معنی تسلیم کرنے اور سلامتی کے ہیں[2] اردو میں کہتے ہیں۔ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے تو اسے کئی صلاحیتیں دے کر پیدا کیا ہے جیسے علم[3]، حواس یعنی سننے کو کان، دیکھنے کو آنکھیں اور سوچنے کو دل و دماغ[4]، اچھائی برائی کی تمیز[5] اور ذات باری کے ادراک کی صلاحیت[6] اور یہ سب دے کر اسے اختیار دے دیا کہ وہ چاہے تو اللہ کو مانے، اس کی اطاعت کا دم بھرے اور زمین میں زندگی اس کی مرضی کے مطابق گزارے یا نہ چاہے تو اللہ کو اور اس کی ہدایت کو نہ مانے۔ اپنی آزاد مرضی سے اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور کبریائی کو بلا شروط وحدود تسلیم کر لینا، پیغمبروں کے ذریعے بھیجی گئی اللہ کی ہدایت کے مطابق زندگی گزارنا اور آخرت کو دنیا کی زندگی پر ترجیح دینا، یہ "اسلام" ہے اور جو شخص اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی کے تابع کر دے اور ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا رویہ اختیار کر لے وہ "مسلم" ہے یعنی اسلام کو ماننے والا اور اس کے مطابق زندگی گزارنے والا اور اس پر عمل کرنے والا۔ یہ ہے 'دین' کا اسلامی تصور۔

لفظ 'دین' کا استعمال

اور جو آدمی اللہ کی الوہیت اور کبریائی کو نہ مانے اور اس کے آگے سر اطاعت بلا شروط وحدود

---

[1] آل عمران ۳:۱۹

[2] ابن منظور، لسان العرب، دار صادر بیروت، جلد ۱۲، صفحہ ۱۸۹

[3] العلق ۹۶:۱تا۵

[4] الاسراء ۱۷:۳۶

[5] الشمس ۹۱:۸

[6] الاعراف ۷:۱۷۲

خم نہ کرے بالفاظ دیگر وہ اللہ کی مرضی کو نہ مانے اور اپنی مرضی کرے اور اپنی عقل پر بھروسہ کرے وہ ہے "کافر" یعنی اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کرنے والا اور اللہ کی ہدایت کے پیکیج کو نہ ماننے والا۔ کافر عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ہیں انکار کرنے والا یعنی وہ شخص جو اللہ کا اور اس کی ہدایت کا انکار کرے۔ یہ ہے دین کا غیر اسلامی تصور۔ جو لوگ اللہ کے عطا کردہ طرز زندگی یعنی دین کو نہ مانیں اور اپنی زندگی گزارنے کا پیکیج اپنی مرضی سے تیار کریں تو یہ ہوگا ان کا اپنا وضع کردہ دین یا طرز زندگی اور نظام حیات۔

خلاصہ یہ کہ مسلم وہ ہے جو زندگی اللہ کی مرضی کے مطابق گزارے اور غیر مسلم یا کافر وہ ہے جو زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزارے۔ جو شخص زندگی اللہ کی مرضی کے مطابق گزارے وہ ہے اللہ کے دین (یا سماوی/آسمانی دین) کا پیروکار اور جو شخص زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزارے وہ گویا اپنے وضع کردہ (وضعی) دین کا پیروکار ہے۔

فرد کے اس رویے کا اطلاق قوم، معاشرے اور تہذیب پر بھی ہوتا ہے یعنی جو قوم، معاشرہ اور تہذیب اللہ کی مرضی اور اس کی بالادستی کو مانے وہ مسلم قوم، مسلم معاشرہ اور مسلم تہذیب ہے۔ اور جو قوم، معاشرہ اور تہذیب زندگی اپنی مرضی اور اپنی عقل کے مطابق گزارے وہ کافر قوم، کافر معاشرہ اور کافر تہذیب ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوگیا کہ دین کا مطلب ہے زندگی گزارنے کا راستہ، طریقہ اور منہج اور اس کی دو بڑی اقسام ہیں: ایک دین الٰہی یا دین سماوی اور دوسرا دین وضعی یعنی انسانوں کا اپنا بنایا ہوا دین اور نظامِ حیات۔ اسلام اللہ کا نازل کردہ دین ہے اور مغربی تہذیب اہل مغرب (امریکہ و یورپ، وغیرہ) کا دین ہے۔

۲۔ مسلمان دین کو، دین الٰہی، یا دین سماوی کے معنی میں استعمال کرنے کے عادی ہیں لہٰذا 'وضعی دین' کا لفظ انہیں اوپرا لگتا ہے لیکن جیسا کہ ہم نے ذکر کیا اس کے "وضعی" ہونے میں لغوی لحاظ سے کوئی مانع نہیں۔ پھر قرآن حکیم نے بھی دین کا لفظ "وضعی" یا غیر الٰہی/غیر سماوی کے معانی میں کئی دفعہ استعمال کیا ہے مثلاً فرمایا:

۔ ﴿لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ﴾ [الکافرون ۱۰۹:۶]

یعنی اے پیغمبر! کفار سے کہہ دیجیے کہ تمہارا دین تمہارے لیے ہے اور میرا دین میرے لیے۔

۔﴿هُوَالَّذِیٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ كُلِّهٖ ﴾[الفتح ۴۸:۲۸]

یعنی جتنے بھی غیر اسلامی ادیان اور غلط نظام ہائے حیات اور طریقہ ہائے زندگی ہیں، ان سب پر دین اسلام کو غالب کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تھا۔

۔﴿وَمَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡهُ ﴾[آل عمران ۳: ۸۵] مطلب یہ کہ جو آدمی اسلام کے علاوہ کسی اور منہجِ فکر وعمل کو'دین' بنائے گا، وہ اللہ کے نزدیک ناقابل قبول ہوگا۔

نبی کریم ﷺ کی کئی احادیث میں بھی لفظ'دین' اسلام کے علاوہ دوسرے ادیان اور نظام ہائے حیات کے لیے استعمال ہوا ہے۔

"قَالَ ابْنُ شِهَابٍ:فَأَخْبَرَنِي عُرْوَةُ بْنُ الزُّبَيْرِ،أَنَّ عَائِشَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهَا، زَوْجَ النَّبِيِّ ﷺ قَالَتْ: وَاسْتَأْجَرَ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَأَبُو بَكْرٍ رَجُلًا مِنْ بَنِي الدِّيلِ هَادِيًا خِرِّيتًا، وَهُوَ عَلَى دِينِ كُفَّارِ قُرَيْشٍ، فَدَفَعَا إِلَيْهِ رَاحِلَتَيْهِمَا، وَوَاعَدَاهُ غَارَ ثَوْرٍ بَعْدَ ثَلاَثِ لَيَالٍ بِرَاحِلَتَيْهِمَا صُبْحَ ثَلاَثٍ."[1]

''حضرت عروہ بن زبیرؓ نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ (ہجرت کے وقت) رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر صدیقؓ نے بنی دیل کے ایک شخص کو اپنا گائیڈ مقرر کیا تھا جو کہ کفار کے دین پر تھا۔ دونوں نے اس کو اپنی سواریاں دیں اور تین راتوں کے بعد صبح کو اُسے اپنی سواریوں سمیت طلب کرلیا۔''

ان آیات وحدیث سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کے علاوہ جتنے مناہجِ فکر وعمل، نظام ہائے حیات اور طرز ہائے زندگی ہیں وہ بھی ''دین'' ہیں لیکن اللہ کے نزدیک قابل قبول نہیں ہیں اور اللہ کے نزدیک صحیح دین یعنی زندگی گزارنے کا صحیح منہج، صحیح طریقہ اور صحیح اسلوب صرف اسلام ہی ہے۔

---

[1] صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۲۲۶۴

ان تفصیلات سے ظاہر ہے کہ دین سماوی اورالوہی بھی ہوسکتا ہے اورانسانوں کا اپنا وضع کردہ بھی۔

کیا مغربی فکر وتہذیب کی اساس عیسائیت ہے؟

اس وقت تک ہم نے جو عرض کیا ہے اس سے واضح ہے کہ مغربی تہذیب اگرچہ خود کو ''تہذیب'' کہتی ہے'دین' یا 'مذہب' نہیں لیکن درحقیقت وہ دین ہی ہے اور مکمل نظام حیات ہے جو انسانی عقل پر مبنی ہے اور خدا کے مقابلے میں انسان کی خدائی کا علمبردار ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ مغربی تہذیب عیسائیت کی پیداوار ہے نہ صرف خلط مبحث ہے بلکہ خلاف حقائق بھی ہے۔ یہاں ہم اس نقطے کی مزید وضاحت کیے دیتے ہیں:

i۔ اگرچہ اہل کتاب سماوی دین کو مانتے ہیں لیکن قرآن حکیم واضح کرتا ہے کہ وہ صحیح دین سے انحراف کر چکے ہیں، کتاب اللہ کو بدل چکے ہیں لہٰذا ان کا تصور توحید ورسالت وآخرت کرپٹ ہو چکا ہے اور اسی وجہ سے وہ نبی کریم حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو بھی نہیں مانتے لہٰذا وہ بھی ایک لحاظ سے کافر (منکر حق) اور غیر مسلم ہیں لیکن ان میں اور ان کفار میں جو صاحب کتاب نہیں ہیں، بہر حال کچھ فرق ہے اور قرآن وسنت نے ان کے ساتھ کھانے پینے اور نکاح کی اجازت دی ہے۔ تاہم یہ بھی مشروط ومحدود ہے۔ ان کا ذبیحہ اسی وقت کھایا جاسکتا ہے جب اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ اور ان کی خواتین سے اسی وقت نکاح کیا جاسکتا ہے جب وہ پاکباز ہوں۔ یہ دونوں شرطیں آج کل مغربی دنیا کے نام نہاد عیسائیوں (اور یہودیوں) میں بالعموم نہیں پائی جاتیں لہٰذا ان کا اہل کتاب ہونا اور ہمارا ان کو اہل کتاب ہونے کی وجہ سے خصوصی اہمیت اور حیثیت دینا بے معنی ہے۔

ii۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مغربی تہذیب کی عمارت کی تعمیر عیسائیت کے ملبے پر ہوئی ہے۔ مغربی تہذیب مذہب دشمن ہے۔ وہ کسی سماوی ہدایت کو نہیں مانتی۔ وہ اللہ، رسول، وحی، کتاب، آخرت کو تسلیم نہیں کرتی۔ وہ مادہ پرستی، انسان پرستی، عقل پرستی اور نفس پرستی کی قائل ہے لہٰذا اس کا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ اس نے اگر عیسائیت کو بالکل ختم نہیں کیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے عیسائیت کو مغلوب کر کے اسے کونوں کھدروں میں دھکیل دیا ہے اور اسے فرد کی ذاتی اور روحانی زندگی تک محدود کر دیا ہے کہ وہ گھر بیٹھ کر یا ہفتے میں ایک دن چرچ جا کر گا کر دعا مانگ سکتے ہیں، انجیل کا مطالعہ کر سکتے ہیں، چرچ میں جا کر نکاح کر سکتے ہیں، پادری سے گناہوں کی معافی مانگ

سکتے ہیں۔ کرسمس کی تقریب منا سکتے ہیں اور بس۔اتنی سی عیسائیت کو مغربی تہذیب نے بمشکل برداشت کیا ہوا ہے اور وہ بھی قانونی سطح پر ورنہ جہاں تک عملی زندگی کا تعلق ہے اہل مغرب کی اکثریت عملاً اتنی سی عیسائیت پر بھی عمل نہیں کرتی۔لہٰذا اس بات میں کوئی وزن نہیں بلکہ اس میں ایک فیصد بھی حقیقت نہیں کہ مغربی تہذیب عیسائیت کی پیداوار ہے۔درحقیقت مغربی تہذیب کی فکری بنیادیں یونان کی وحی مخالف اور عقل پرستانہ فکر وتہذیب پر استوار ہیں نہ کہ کسی سماوی دین پر۔

جب ہم کہتے ہیں کہ مغربی تہذیب دین کفر ہے، دین غیر اللہ ہے تو اس کے دو بنیادی سبب ہیں: ایک یہ کہ مغربی تہذیب کے وہ اساسی افکار جن کی وہ پیداوار ہے، وہ کفر والحاد پر مبنی ہیں اور دوسرے یہ کہ قرآن حکیم نے بھی انہیں کافر وملحد کہا ہے۔اس کی کچھ تفصیلات ملاحظہ فرمائیں (جاری ہے)۔

بقیہ: غیر ملکی پبلشر کی کتاب پر پابندی

نکتہ وہی ہے کہ کسی پبلشر کو یہ حق نہیں کہ اس کے مصنفین اپنی ذاتی رائے، اپج، اپنے خیالات کی بنا پر کسی فرد کو ازخود قومی مشاہیر میں سے ایک قرار دیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔اگر ماضی میں ایسا ہوا تو اب نہیں ہونا چاہیے۔

ایک بار پھر واضح کر دوں کہ میں ملالہ کو گمراہ، ملک دشمن قوتوں کا ایجنٹ وغیرہ وغیرہ نہیں سمجھتا۔ ملالہ کے بارے میں میرا تاثر ابھی غیر جانبداری کا سا ہے۔ وہ اچھا کریں گی تو ہم سراہیں گے۔غلط طرز عمل یا غلط بیان دیں گی تو تنقید کریں گے۔ پاکستان اور اپنی قوم کے لئے انہیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ جب کریں گی تب انہیں ہیرو، محسن سب کچھ مان لیں گے۔ ملالہ کے پرجوش مداحین تھوڑا انتظار کر لیں اور اپنی ممدوح کو کچھ پرفارم کرنے، ثابت کرنے کا وقت دیں۔نوبیل انعام تو انہیں مفت میں مل گیا۔اب خود کو نوبیل کا مستحق ثابت کریں۔اور کچھ نہیں تو اتنا ہی کر ڈالیں جتنا ان کے ساتھ نوبیل انعام میں شریک کیلاش ستیارتھی نے بھارت میں سماجی کام کیا ہے۔

اسلام اور مغرب

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

مغربی مفکرین اور فلاسفہ کے افکار و آراء (آخری قسط)

ایک مختصر مگر جامع تجزیہ

وٹگنسٹائن حق کو دنیا کے باہر سمجھتا ہے

اس کے بعد ہم بیسویں صدی کے ایک اور بڑے فلسفی کا تذکرہ کرتے ہیں جس کا نام ہے Wittgenstein ۔ Wittgenstein بھی ایک Positivist ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عقلی ذرائع سے Ontological حقائق کا ادراک نہیں کیا جاسکتا اور بالخصوص Ontological حقائق کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن وہ باقی Positivists سے ان معنوں میں مختلف ہے کہ وہ کہتا ہے گو کہ Ontological حقائق کا عقل کی بنیاد پر ادراک نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا اپنا جملہ یہ ہے 'Metaphysics is Unsayable' یعنی Ontological حقائق کو آپ بیان نہیں کر سکتے لیکن اس سے ثابت یہ ہوتا ہے کہ دنیا خود کوئی حقیقت نہیں ہے۔ دنیا کے اندر نہ حق ہے نہ قدر ہے! اگر کہیں حق یا قدر ہے تو وہ دنیا سے باہر ہے۔ دنیا کے اندر حق تک رسائی کا کوئی ذریعہ نہیں۔

جس زمانے میں اس نے کتاب لکھی تھی ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ زبان کو حق کے ادراک کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے اور زبان کو آفاقی حیثیت دیتا ہے لیکن اس کی اپنی تحریر اس کا انکار کرتی نظر آتی ہے کہ زبان کے تجزیے (Analysis) کے ذریعے حق تک کوئی رسائی ممکن ہے۔ وہ کہتا ہے کہ لوگ محض زبان کے کھیل کھیلتے ہیں جس سے کوئی آفاقی سچ اور حق اخذ نہیں کر سکتے۔ لیکن اس کے باوجود وہ یہ بھی کہتا ہے کہ آفاقی حقائق کا ادراک بہت اہم ہے اور جو چیز ثابت ہوتی ہے وہ یہ کہ ہم عقل کے ذریعے حق کا ادراک نہیں کر سکتے اور یہ کہ عقل سے اوپر اٹھنے کی ضرورت ہے۔ مگر عقل سے اوپر کیسے اٹھا جائے، اس کے بارے میں وہ خاموش ہے لیکن وہ MetaPhysical اور Ontological Realities کی اہمیت اور اصلیت سے اور ان کی ضرورت سے انکار نہیں کرتا اور ان معنوں میں وہ دنیا کو ہیچ اور غیر ضروری سمجھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں حق اور خیر موجود نہیں ہے۔ اگر حق اور خیر موجود ہے تو وہ کہاں ہے اور اس تک کیسے رسائی حاصل کی جاسکتی ہے، وہ اس کا کوئی جواب نہیں دیتا۔ بلکہ وہ کہتا ہے کہ اس کا کوئی جواب دیا نہیں جاسکتا۔ ان معنوں میں

اس میں اور Heidegger میں، جو بیسویں صدی کا ایک اور اہم فلسفی ہے، بڑی مماثلت ہے۔

ہائیڈیگر، Wittgenstein اور مابعد الطبیعیاتی سوالات

Heidegger کہتا ہے کہ انسان محض دنیا میں پھینک دیا گیا ہے (He has been thrown in the world)، لیکن وہ اس پر مجبور ہے۔ وہ اپنے آپ کو دنیا میں پاتا ہے اور اسے نہیں معلوم کہ وہ کہاں سے آیا ہے؟ اور کہاں جائے گا؟ اس کی زندگی کی کیا حیثیت ہے؟ کائنات میں اس کا کیا مقام ہے؟ اس کے پاس کوئی جواب موجود نہیں ہے۔ لیکن وہ اس بات پہ مجبور ہے کہ وہ ان سوالات کا جواب تلاش کرے۔ Heidegger کہتا ہے کہ ان سوالات کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا لیکن اگر آپ کو ایک ایسی زندگی گزارنا ہے جو معنی خیز ہو، جو Valuable زندگی ہو۔ تو ان سوالات کا جواب آپ کو مستقل تلاش کرتے رہنا چاہیے۔ اور وہ کہتا ہے کہ مغربی تہذیب کا زوال اسی میں ہے کہ اس نے Being کے سوال کو اور Ontological سوالات کو بھولنے کی کوشش کی۔ اس وجہ سے مغربی تہذیب ایک مکینیکل اور ٹیکنالوجیکل تہذیب بن کر رہ گئی ہے۔ معنی اور معنویت غائب ہو گئی ہے یعنی اس نے عملاً اور دانستہ طور پر ان Ontological سوالات کا جواب دینے سے پہلو تہی کی ہے۔ ان سوالات کا جواب دینا ناممکن ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ فرد یا وجود کی حدود متعین ہیں۔ آپ جو کچھ کرتے ہیں وہ اظہار ہے، معاشرتی تعلقات کا اظہار! جو کچھ ہو رہا ہے وہ ''The they'' سے تشکیل پاتا ہے۔ یعنی آپ کی روزمرہ کی زندگی (Every dayness)۔ اس کے مطابق آپ متعین ہوتے ہیں۔ جو کچھ دن بھر ہوتا رہتا ہے، آپ کرتے رہتے ہیں! چلے جاتے ہیں! واپس آتے ہیں! کھانا کھاتے ہیں! آپ کا طرز زندگی آپ کو مہلت نہیں دیتا کہ جو کچھ ہوتا رہتا ہے اس کے علاوہ کچھ اور ہونے کی جستجو کر سکیں۔ چنانچہ آپ کی شخصیت بہت بڑی حد تک اس سے متعین ہوتی ہے کہ ''The they'' آپ پر کس حد تک غالب آتا ہے۔

بامعنی وجود (Authentic Existence) ایک خاص تصور ہے۔ ''Existence'' اس کے مطابق اس وجودیت کو حاصل کرنے کے لیے آپ کو Ontological سوالات پہ غور کرنا چاہیے۔ وہ طرزِ زندگی آپ کو اختیار کرنا چاہیے جو آپ کو ''The they'' اور Fallenness کی Determination سے آزاد کرائے۔ یہ Authentic Existence آپ اسی طریقے سے Choose کر سکتے ہیں جب آپ اپنی موت کو سنجیدگی سے لیں۔ Heidegger کہتا ہے کہ آپ جو اکیلا کام صرف اپنے لیے کرتے ہیں (جہاں آپ کی Existence مکمل Realize

ہوتی ہے) وہ آپ کی موت ہی میں وہ تخلیق ہے جو صرف آپ کرتے ہیں۔ کوئی آپ کے لیے مر نہیں سکتا، آپ خود مرتے ہیں، اپنے لیے مرتے ہیں۔ چنانچہ Authentic Existence وہ Existence ہے جس میں آپ موت کا سنجیدگی کے ساتھ سامنا کرتے ہیں اور موت کا Seriously سامنا کر کے ہی آپ اپنے آپ کو The they سے اور دنیا داری (Every Dayness) سے نجات دلا سکتے ہیں۔ لیکن موت کا سنجیدگی سے کیسے سامنا کیا جائے؟ موت کو بامعنی کیسے بنایا جائے؟ Heidegger کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں! Heidegger اس معاملے میں بالکل ویسے ہی خاموش ہے جیسے Wittgenstein اس بارے میں خاموش ہے کہ

Value is outside the world and how do you access the Value? Truth is outside the world and how do you access the truth?

اس سوال کا Wittgenstein کے پاس کوئی جواب نہیں۔ اگر فی الواقع Authentic Existence وہی ہے جو موت کا سنجیدگی سے سامنا کرے تو الٰہی علوم، علوم لدنی اور معارف کے علاوہ کوئی طریقہ نہیں جس کے ذریعے آپ بامقصد موت کا سامنا کر سکیں۔ Heidegger اور Wittgenstein کے یہاں یہ Realization موجود ہے کہ مغربی تہذیب نے ان سوالات کو فراموش کر دیا ہے جن کا تعلق مابعد الطبیعیاتی حقائق اور موت سے ہے۔ مغربی تہذیب نے وہ تمام راہیں مسدود کر دی ہیں جن کے ذریعے ان سوالات کا جواب حاصل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ان کا جواب Wittgenstein کے پاس ہے اور نہ Heidegger کے۔

زندگی کے معنی کہاں ملیں گے؟

اگر ہم Wittgenstein کی تعلیمات کا خلاصہ عرض کریں تو وہ یہ کہتا ہے کہ معنی کو موت میں تلاش کرنا ہے۔ معنی کہاں ملیں گے؟ انسان کو زندگی کی حقیقت کا ادراک کہاں ہوگا؟ Habermas موت کا انکار ان معنوں میں کرتا ہے کہ وہ کہتا ہے کہ زندگی کے معنی کا ادراک زندگی میں ہوگا، موت میں نہیں ہوگا۔ معنی زندہ رہنے اور زندگی گزارنے میں حاصل ہوں گے۔ (ہیبر ماس بیسویں صدی کا اہم فلسفی ہے جو موجودہ دور میں تنویری اقدار کا دفاع پیش کر رہا ہے۔ موجودہ دور میں اس کی سطح کا کوئی فلسفی موجود نہیں۔ پہلے یہ امریکہ میں تھا اب جرمنی واپس آ گیا ہے) Habermas کہتا ہے کہ معنی موت میں نہیں، زندگی میں ہیں اور Self انسانیت کا حصہ ہے۔ اور

پوری انسانیت میں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اسی دنیا میں ایک ساتھ زندگی گزارتے ہیں اور یہ زندگی سب کو مل کر ساتھ گزارنا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر نفوس کے درمیان ہونے والا تبادلہ خیال (Inter Subjective communication) صحیح اصولوں کے مطابق مستقل ہوتا رہے (یعنی Discourse میں بھی اور Practices میں بھی) ، تو اس کے نتیجے میں Experience کے معنی واضح ہوجائیں گے۔

ہیبر ماس کا فلسفہ کیا ہے؟

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہیبر ماس، Hermeneutics اور Phenomenology وغیرہ سے متاثر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ Inter-subjective communication کے ذریعے ہم اپنے تجربات کے ایسے معنی حاصل کرسکتے ہیں جو فی الواقع آفاقی معنی ہوں۔ ہم ایسے حقائق کا ادراک کرسکتے ہیں جو فی الواقع آفاقی ہوں۔ اسی دنیا میں، اسی زندگی کو Share کر کے۔ اور ایک دوسرے سے بلا روک ٹوک Communcate کر کے ان معنوں کا ادراک کرسکتے ہیں لیکن وہ کہتا ہے کہ دنیا میں فی والواقع ایسا ہوتا نہیں ہے۔ اور ایسا کیوں نہیں ہوتا اس کی وہ بہت سی وجوہات بیان کرتا ہے۔ لیکن بنیادی طور پر وہ کہتا ہے کہ سیاسی قوت اس وقت ایسی قوت ہے، جو اس طریقے سے مرتب ہے کہ Inter-subjective communication کو ممکن نہیں ہونے دیتی تو اگر حقیقی جمہوریت (True Democracy) قائم کی جائے اور حقیقی جمہوریت سے اس کی مراد یہی ہے کہ Inter-subjective communication کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں (بالخصوص میڈیا نے کھڑی کر رکھیں ہیں مثلاً کمیونیکیشن کو Distort کرنا وغیرہ) ان کو ختم کردیا جائے تو ہم Experiences کا تبادلہ کر کے Meaning تک رسائی حاصل کرسکتے ہیں اور Meaning تک رسائی کرنے کے لیے حقیقی جمہوریت قائم کرنا ضروری ہے۔ ایسی جمہوریت جہاں کمیونیکیشن کو کسی خاص مقصد کے لیے استعمال نہ کیا جارہا ہو، وہاں ہم صحیح معنی تک پہنچ سکتے ہیں۔

انسان خالق ہے اور خالق کائنات بھی! سارتر کا فلسفہ

بیسویں صدی کا ایک اور مفکر جس کا Existentialism میں بہت اہم مقام ہے وہ ہے سارتر۔ سارتر کے مطابق آزادی مطلق ہے اور کوئی بھی ایسے Choices نہیں ہیں جو لازماً انسان کو اختیار کرنے پڑیں۔ آزادی مطلق ہے اور کوئی قطعی Choice موجود نہیں۔ ایسی کوئی بھی چیزیں

نہیں ہیں جنہیں انسان اختیار کرنے پر مجبور ہے بلکہ آزادی Absolute ہے۔ نفس، ذات یا Self خودکوئی چیز نہیں ہے۔ Self کو Create کرنا پڑتا ہے۔ یہاں سے بنیادی فرق پیدا ہوتا ہے کہ انسان خالق ہے۔ 'The Self has to be Created'۔ Self خود اپنے آپ کو تخلیق کرتا ہے اور Self دنیا کو ویسا بنا سکتا ہے جیسا وہ ہے۔ Self کے اندر یہ استطاعت ہے کہ نہ صرف وہ اپنے آپ کو خود تخلیق کرے بلکہ وہ دنیا کو بھی تخلیق کرے۔ وہ دنیا کو، جس طریقے سے چاہتا ہے، تخلیق کر سکتا ہے اس لیے کہ کوئی بھی Choice قطعی اور ضروری نہیں ہے۔ آزادی تو مطلق ہے۔

چنانچہ انسان خالق ہے۔ اپنے آپ کا بھی اور کائنات کا بھی۔ وہ کائنات کو ویسا ہی بنا سکتا ہے جیسا وہ اس کو بنانا چاہتا ہے۔ چنانچہ جس چیز کی بنیادی طور پر انسان کوشش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ خدا بن جائے۔ Explicitly سارتر کے ہاں یہ تصور موجود ہے (پوری تاریخ میں بین السطور اور سارتر کے ہاں صاف الفاظ میں ہے کہ انسان کی اصلی خواہش یہی ہے کہ وہ خدا بن جائے۔ خدا کن معنوں میں بن جائے؟ ان معنوں میں کہ وہ جو چاہے اسے ممکن بنا دے۔) اور اگر آپ خدا نہیں بننا چاہتے تو یہی Bad Faith ہے۔ یعنی خدا بننے کی خواہش نہ کرنا Bad Faith ہے۔ دوسری جگہ وہ کہتا ہے کہ دوسرے کا وجود جہنم ہے (Hell is other people)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی خدا بننا چاہتے ہیں لہٰذا خدا بننے کا عمل کیا ہے؟ خدا بننے کا عمل یہ ہے کہ آپ زیادہ سے زیادہ آزادی اور تخلیقیت کے لیے اور زیادہ سے زیادہ جستجو اور جدوجہد کریں اور اس کو ممکن بنانے کے لیے کہ جیسا آپ دنیا کو بنانا چاہتے ہیں، اسے ویسا بنا دیں! یا آپ خود جیسا بننا چاہتے ہیں ویسا بن جائیں۔ لیکن سارتر کا ہی ایک ہم عصر اور ساتھی Camus کہتا ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ آپ کی تخلیقیت کی ایک حد ہے اور وہ حد کیا ہے؟ وہ موت ہے! جس وقت آپ مرجاتے ہیں اس وقت کیا واضح ہوتا ہے؟ اس وقت یہ واضح ہوتا ہے کہ زندگی ایک مہمل چیز ہے، زندگی بے معنی شے ہے۔ تو فی الواقع زندگی ایک Tragedy ہے۔ Tragedy ان معنوں میں کہ کوشش آپ اس چیز کی کرتے ہیں جو کبھی ممکن ہو ہی نہیں سکتی۔ جس چیز کو آپ کبھی تخلیق ہی نہیں کر سکتے۔ وہ ہدایت ہے۔ آپ بنیادی طور پر خدا بننا چاہتے ہیں تو خدا کی تو یہی خصوصیت ہے کہ نہ اس کی انتہا ہے نہ ابتداء۔ جبکہ انسان کی انتہا موت ہے لہٰذا خود تخلیقیت کے لیے انسان کی سعی و جدوجہد اور کائنات کی تخلیقیت کی کوشش فعل عبث ہے اس لیے کہ انسان کی موت یہ ثابت کرتی ہے کہ انسان محدود ہے اور انسان کی تخلیقیت اختتام پذیر ہے۔

فوکالٹ کا فلسفہ: آفاقی قوانین تخلیق نہیں کیے جا سکتے

ایک دو اور فلسفیوں کا تذکرہ کروں گا لیکن بنیادی طور پر آخری فلسفی جس کا میں تذکرہ کرنا چاہوں گا وہ Foucault ہے۔ فوکالٹ کے دو استاد تھے اور دونوں ہی Structuralist تھے۔ ایک Levi Strauss اور دوسرا Althusser، جو مارکسسٹ تھا۔ لیوی سٹراس Materialist اور Anthropologist تھا اور اس کا اثر فوکالٹ پر ہوا حالانکہ اس کا مقام Levi Strauss اور Althusser سے بلند ہے۔ فوکالٹ محض Structuralist نہیں ہے بلکہ ایک آگے کی چیز ہے۔ اس کی فکر میں زیادہ گہرائی ہے۔ وہ مغربی تہذیب کے زیادہ آدرشوں کو جمع کرتا ہے۔ فوکالٹ بیسویں صدی کے دوسرے نصف کا بہت اہم فلسفی ہے۔ ہم گفتگو اس سوال سے شروع کرتے ہیں کہ ساختیت (Structuralism) کا مرکزی خیال کیا ہے؟ ساختیت کا مرکزی خیال یہ ہے کہ انسانی تعلقات کے جو قوانین ہیں ان کا ادراک آپ زبانوں یا ثقافت کے تجزیے کے ذریعے کر سکتے ہیں۔ ثقافت اور زبان کے تجزیے کے ذریعے آپ یہ بھی جان سکتے ہیں کہ انسانوں کے رویوں کو متعین کرنے والے قوانین کون سے ہیں۔ اسی مرکزی خیال کی تجدید (Modification) کر کے فوکو نے مغربی تہذیب کا مطالعہ کیا۔ مغربی تہذیب کے جو کلیدی تصورات ہیں ان کا جائزہ لیا اور ان کی Genealogy دریافت کرنے کی کوشش کی۔ اس نے مغربی تہذیب کا اس لیے مطالعہ کیا تاکہ وہ معلوم کر سکے کہ مغربی اقدار کی تاریخی جڑیں (Historical Root) کیا ہیں؟ کہاں سے وہ تصورات نکلے ہیں جن کی بنیاد پر آج مغربی تہذیب اپنی توجیہ (Justification) پیش کرتی ہے؟ زیادہ تفصیلی بیان ممکن نہیں لیکن جو چیز سمجھنا ہمارے لیے ضروری ہے وہ یہ کہ اس علم کے ذریعے وہ اس نتیجے تک پہنچا کہ ایسے قوانین جو آفاقی ہوں وہ کسی خاص تہذیب کے مطالعے سے یا کسی خاص Ideology کو واضح کرنے سے نہیں نکلتے۔ مغربی تہذیب کا اس نے جو مطالعہ اور تجزیہ کیا، اس نے اس کو اس نتیجے پر پہنچا دیا کہ آفاقی قوانین کو Derive نہیں کیا جا سکتا۔

مغربی تہذیب انسان کی موت کا اعلان کرتی ہے

فوکالٹ کہتا ہے کہ ان معنوں میں مغربی تہذیب کا المیہ یہ ہے کہ یہ صرف خدا کی موت کا اعلان نہیں کرتی (جیسے نطشے نے کہا تھا کہ خدا مر گیا) بلکہ یہ تہذیب تو انسان کی موت کا بھی اعلان کرتی ہے۔ خدا مر گیا ان معنوں میں کہ اب Will to power کے نتیجے میں ہم اپنی بقاء کو یقینی

بنا سکتے ہیں۔

اور ہمیں کسی خدا کی ضرورت نہیں کہ زندگی کیسے بسر کی جائے تا کہ ہمیں ابدی زندگی ملے۔ Will to power کے ذریعے ہم خود Survive کر سکتے ہیں۔فوکالٹ کہتا ہے کہ یہ صرف خدا کی موت نہیں بلکہ انسان کی بھی موت ہے۔(This is not only the death of God but also the death of man)۔انسان کی موت کیا ہے؟ ہم اپنے تجربات کے حوالے سے آفاقی قوانین نہیں شناخت کر سکتے جس کی بنیاد پر ہم کہہ سکیں کہ انسانیت کے زندگی گزارنے کا یہ طریقہ ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ علم معاشرتی بنیادوں پر تشکیل کردہ ہے اور علم کو جو لوگ معاشرتی بنیادوں پر تشکیل دیتے ہیں ان کا اس کے پیچھے ایک خاص مقصد ہوتا ہے۔ وہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ وہ ایک خاص معاشرے کے اندر غالب رہیں۔

مغربی تہذیب کا بنیادی مقصد دنیا پر غلبہ ہے

فوکالٹ کے یہاں علم اور قوت ایک ہی چیز ہے۔ وہ علم اور قوت کے درمیان ایک لکیر کھینچتا ہے۔ جہاں کہیں بھی وہ 'علم' اور 'قوت' لکھتا ہے تو اکٹھا لکھتا ہے 'قوت/علم' (Knowledge/Power) کیونکہ اس کے نزدیک بھی اصل چیز بقاء ہے۔ اصل چیز زندہ رہنا ہے، اصل چیز بالادستی قائم کرنا ہے، حق کی تلاش اصل نہیں ہے۔ چنانچہ مغربی تہذیب کے بنیادی آدرش اور بنیادی اقدار مغربی تہذیب کو غالب کرنے کے سوا کچھ نہیں۔فوکو کہتا ہے کہ مغربی فکر کے بنیادی تصورات بنیادی طور پر مغرب کے غلبہ کے ذرائع ہیں اور وہ ان اقدار کو حق سمجھتا ہے۔یعنی فوکو کے ہاں آزادی کی کوئی نفی نہیں (آزادی وہ واحد تصور ہے جس پر مغرب کا ہر مفکر متفق ہے)۔آزادی وہ قدر مشترک ہے جو مغربی تہذیب کی بنیادی خصوصیت ہے۔ وہاں آزادی پر یقین ہے، ایمان ہے۔آزادی پر ایمان انسان پر ایمان کے مماثل ہے، بلکہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ انسان قائم بالذات ہے۔اسی لیے مغربی تہذیب کا بنیادی کلمہ ہے "لاالٰہ الا الانسان"۔اس کو کہیں بہت زور سے کہا گیا ہے کہیں کم زور سے۔اہل مغرب کم از کم علمی بنیادوں پر آزادی کی قدر پر متفق ہیں۔فوکو بھی اس سے متفق ہے۔فوکو کے ہاں اس بات کی Realization اور اس کا اقرار موجود ہے کہ مغرب کی اقدار کا فروغ ہی غلبے کا ذریعہ ہے اور ان اقدار کی کوئی آفاقی حیثیت نہیں۔اس کے نتیجے میں وہ یہ فیصلہ نہیں کرتا کہ یہ اقدار رد کی جائیں۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ یہ کہتا ہو کہ انسان اس چیز کی مستقل

کوشش کرتا ہے کہ اپنی خودارادیت کو برقرار رکھ سکے۔ وہ غلبہ کے خلاف ہمیشہ جدوجہد کرتا ہے، لیکن اس کو یہ خودارادیت کس چیز نے بخشی ہے؟ سرمایہ داری نے!

دریدا (Derrida) کا فلسفہ ہے؟

آخری آدمی جس کے بارے میں کچھ عرض کروں گا وہ Derrida ہے۔ ساختیت (Structuralism) میں اس کی بھی خاص اہمیت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمام Struggle وغیرہ بے معنی ہے اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ اصل میں Subject تو ہے ہی نہیں، انسان تو موجود ہی نہیں۔ صرف تعلقات ہیں۔ ان کو آپ کتنا بھی Analyse کرلیں آپ کو یہ پتا چلتا ہے کہ ایک خاص Structure Power کو Sustain کرنے والے ہیں لہٰذا آپ تو محض Deconstruct کرسکتے ہیں۔ نہ کوئی Subject ہے نہ کوئی Author ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے صرف تعلقات کا ایک تانا بانا ہے۔ اس کو جب آپ دیکھتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ قوت کیسے مرتکز ہو رہی ہے۔ آپ کو ہر چیز کی اصل حقیقت کو بیان کردینا ہے اور وہ کیسے بیان کرسکتے ہیں (Through a power of Deconstruction)۔ دریدا کی رائے کے نتیجے میں اس کے ہاں سے کوئی مثبت خیال نہیں نکلتا لیکن مغربی تہذیب کے مختلف آدرشوں کی جو Inconsistencies ہیں ان Inconsistencies کو بیان کرنے کے لیے Derrida کا Discourse کسی نہ کسی حد تک اہمیت کا حامل ہے۔

ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اسلامی الٰہیات اور اسلامی تصورات Ontology کے سوالات کو بنیاد بنا کر اسی طریقے سے کہ جس پر ہمارا اجماع ہے، ان مغربی مفکرین کا اسلامی محاکمہ پیش کریں۔ کانٹ، ہیگل، مارکس، نطشے، فرائڈ، وٹگنسٹائن، ہیبر ماس، ہائی ڈیگر اور فوکو۔ جب ہم یہ کام کرنا شروع کریں گے اس وقت ہم مغربی تہذیب کی اصلیت اور روحانیت کا ادراک حاصل کرسکیں گے۔ مغربی تہذیب ایک باطل تہذیب ہے اور مغربی تہذیب سے کسی مصالحت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی تہذیب کے اعتقادات حق، خیر اور آخرت کی نفی پر مشتمل ہیں اور یہ خالص کفر ہیں۔ انسان کے بارے میں، کائنات کے بارے میں، تصور خیر کے بارے میں، تصور حق کے بارے میں یہ انکار شرک سے بھی آگے کی ایک منزل ہے۔ مغرب اور مذاہب عالم اور خصوصاً اسلام کے مابین بنیادی نوعیت کے علمیاتی (Epistemological) اختلافات ہیں لہٰذا مغرب و مشرق کے درمیان مصالحت و مکالمے کی کوشش ایک غیر فطری کوشش نظر آتی ہے۔

عالم اسلام ادارہ

عصرِ حاضر کا مجاہدِ اعظم [۱]

ملا محمد عمرؒ جس نے ۱۳ سال تک تن تنہا جہاد کی قیادت کر کے وقت کے فرعون (امریکہ و نیٹو) کو شکست دی۔
ملا عمرؒ کی فراست، للّٰہیت، کثرت ذکر و عبادت، مراقبہ اور توکل علی اللہ کے آنکھوں دیکھے حالات

ملا محمد عمر مجاہدؒ کی زندگی پر ایک تفصیلی کتاب حال ہی میں افغانستان کے ممتاز مصنف، شاعر، مؤرخ اور دانشور جناب عبدالستار سعید کے ہاتھوں تحریر ہو کر طبع ہو چکی ہے۔ یہ کتاب اس لحاظ سے ایک ممتاز، تاریخی اور مستند دستاویز ہے کہ اس میں ملا عمرؒ کی زندگی سے متعلق تمام واقعات اور حالات ان کے قریبی ساتھیوں، اہل خانہ، بھائی، بیٹے، والدہ اور دیگر رشتہ داروں اور دوستوں سے براہ راست انٹرویو کر کے لکھے گئے ہیں۔ اور وہ لوگ جو مذکورہ حالات میں ان کے ساتھ اور شریک سفر رہے۔ اس کتاب نے ان کی زندگی کے متعلق بہت سے مغالطوں کا خاتمہ کیا اور بہت سے حقائق سے پردہ اٹھایا ہے۔

ماہنامہ ’شریعت‘ نے ملا عمرؒ کی تاریخ وفات کی مناسبت سے شائع ہونے والے زیر نظر خصوصی شمارے میں مذکورہ کتاب کی ساتویں فصل کا پشتو سے ترجمہ کر کے اردو قارئین کی خدمت میں پیش کیا ہے جس میں ۲۰۰۱ء کے اواخر میں امارت اسلامیہ کے سقوط کے بعد ملا عمرؒ کی روپوشی کی زندگی اور امارت اسلامیہ کی تشکیل نو کی پوری تفصیل ذکر کی گئی ہے۔ لیکن اس سے پہلے ملا محمد عمرؒ کی اس تقریر سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے جو انہوں نے مارچ ۱۹۹۶ء میں قندھار میں اس چار روزہ اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کی جس میں انہیں امارت اسلامی افغانستان کا امیر المؤمنین چنا گیا۔ مدیر

تحریک طالبان کی ابتداء کیسے ہوئی؟ (ملا عمرؒ کی زبانی)

’’میں ایک چھوٹے مدرسے میں زیر تعلیم تھا۔ ہم تقریباً پندرہ بیس کے قریب کل طلباء اس

---

[۱] تحریک طالبان/ امارت اسلامیہ افغانستان ایک اردو جریدہ ’’شریعت‘‘ کے نام سے شائع کرتی ہے۔ اس کا مئی ۲۰۲۱ء کا شمارہ (جو تاخیر سے اوائل جولائی میں ہمیں ملا) ملا محمد عمرؒ کی آٹھویں برسی کے حوالے سے خصوصی شمارہ ہے۔ ہم نے اس سے استفادہ کرتے ہوئے یہ مضمون ترتیب دیا ہے۔ مدیر

مدرسے میں ایک ساتھ رہتے تھے۔ اس وقت ملک میں طوائف الملوکی، قتل و غارت، لوٹ مار اور آبروریزی کے واقعات عام تھے۔ زمین فساد سے بھر گئی تھی۔ کسی کو یہ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ ان برائیوں کا خاتمہ کس طرح کیا جائے۔ آپ نے وہ دور دیکھ لیا ہے، کسی کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ اصلاح کا راستہ کون سا ہے۔ اس لیے میرے لیے بھی قرآن کی یہ آیت کیا کافی نہیں تھی کہ ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ کیونکہ میں بالکل بے بس تھا، میں کیا کر سکتا تھا؟ لیکن مَیں نے یہاں توکلِ محض کا فیصلہ کیا۔ یاد رکھو توکل محض کبھی ناکام نہیں ہوتا لیکن یہ بہت مشکل ہے۔ میں علماء کو بھی توکل محض اختیار کرنے کا مشورہ دیتا ہوں۔

لوگ یہ سوال ضرور کریں گے کہ اس تحریک کی ابتداء کیسے ہوئی، اس کے پیچھے کیا محرکات تھے، کون اسے سپورٹ کر رہا تھا، کس نے ان کی تربیت کی ذمہ داری اٹھانے کا وعدہ کیا تھا؟

اس تحریک کی ابتداء اسی چھوٹے مدرسے سے ہوئی جہاں مَیں زیرِ تعلیم تھا۔ مَیں نے یہاں پڑھائی معطل کر کے اپنے ایک دوست کے ساتھ اس تحریک کے آغاز کا فیصلہ کیا۔ سب سے پہلے ہم مدرسے سے پیدل نکلے اور سنگ حصار سے زنگاوات پہنچے [دونوں قندھار کے قصبے ہیں]۔ زنگاوات میں تالکان سے تعلق رکھنے والے سرور نامی شخص نے سفر کے لیے موٹر سائیکل فراہم کی اور ہم تالکان پہنچے۔ بس یہی اس تحریک کی ابتداء تھی۔ پھر مَیں نے اپنے ساتھی مولوی صاحب سے کہا کہ چلو قندھار کے چھوٹے مدارس اور مساجد کے حجروں میں مقیم طلباء کو اس تحریک میں شامل ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ صبح ہم نے ایک مدرسے سے آغاز کیا جہاں ۱۴ طلباء زیرِ تعلیم تھے۔ ہم نے انہیں اکٹھا کیا اور ان سے کہا کہ اللہ کے دین کی پامالی سرِعام ہو رہی ہے۔ ملک میں فسق و فجور اور قتل و غارت کا دور دورہ ہے، عام شاہراہ پر لوگوں کو قتل کر کے لاش کو پتھروں پر رکھ لیا جاتا ہے کسی کو لاش اٹھانے کی اجازت تک نہیں دی جاتی۔ برائیاں سرِعام ہو رہی ہیں جبکہ دین پر عمل چھپ کر کیا جا رہا ہے۔ ان حالات میں پڑھائی نہیں ہو سکتی، اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے پڑھائی چھوڑنا بہتر ہے۔ اگر واقعی آپ طلباء دین کی خدمت کا جذبہ رکھتے ہو تو اٹھو اور عملی قدم اٹھاؤ، کیونکہ یہ مسائل زندہ باد اور مردہ باد سے حل ہونے والے نہیں ہیں۔ ہم نے انہیں یہ بھی بتایا کہ ہم سے کسی نے مالی امداد یا ہتھیار فراہم کرنے کا وعدہ نہیں کیا ہے۔ ہم انہی علاقوں میں دیندار عوام سے کھانا اور مالی مدد کا

مطالبہ کریں گے۔ وہ دے دیں تو ٹھیک لیکن زبردستی کسی کے ساتھ نہیں کریں گے۔ اور ہاں! اس کے بعد پڑھائی کا نہیں سوچنا کیونکہ یہ ایک ہفتے، مہینے یا سال کا کام نہیں۔ کیا کوئی تیار ہے ہماری اس تحریک میں شامل ہونے کے لیے؟ مَیں ان کا حوصلہ بڑھانے کے لیے یہ بھی کہتا رہا کہ دیکھو ان مسلح جنگجوؤں کو جو باطل اور فاسق ہو کر بھی اس شدید گرمی میں اپنے مورچوں میں بیٹھے ہوئے ہیں لیکن ہم اللہ کے دین کے لیے کیوں کچھ مشقت برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے؟ ہم کیوں اللہ کے دین پر عمل اعلانیہ نہیں کر سکتے۔ اتنی غفلت اچھی نہیں ہے۔

جب مَیں نے انہیں یہ بتایا کہ اسلحہ نہیں، کھانے کا انتظام نہیں، کسی سے مالی امداد ملنے کی توقع نہیں تو اللہ کی قسم ان ۱۴ طلباء میں کسی نے بھی ہمارے ساتھ جانے کی حامی نہیں بھری۔ سب نے انکار کیا۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ اگر صرف جمعے کو کوئی کام ہو تو مَیں حاضر ہوں۔ مَیں نے کہا کہ جمعہ کے بعد کون کرے گا؟ اللہ شاہد ہے کہ واقعہ اسی طرح ہے اور روزِ محشر اللہ کے حضور بھی یہی گواہی دوں گا۔

اگر مَیں اس مدرسے کو دوسرے مدارس پر قیاس کرتا تو میں واپس اپنے مدرسے آجاتا لیکن یہ توکل محض کا نتیجہ تھا کہ مَیں نے ہار نہیں مانی۔ مَیں نے اللہ کے ساتھ جو وعدہ کیا تھا اس پر وفا کی اور اللہ نے مجھے سرخرو کیا۔ خیر اس کے بعد ہم ایک اور حجرے (حجرہ، مسجد سے متصل کمرہ جہاں افغانستان میں طلباء کی رہائش ہوتی ہے اس کی حیثیت ایک چھوٹے سے مدرسے کی ہوتی ہے) کی طرف چل پڑے جہاں ۵ یا ۷ طلباء تھے۔ ان کو بھی ہم نے اسی طرح سخت شرائط بتائیں لیکن ان تمام سات طلباء نے اپنے نام لکھوا دیے۔ اب دیکھیں کہ دونوں مدارس تھے۔ ایک علاقے، ایک زبان اور الحمدللہ ایک امت تھے، ایسا نہیں تھا کہ اوّل الذکر بچے تھے اور آخر الذکر جوان، یا وہ جوان تھے اور یہ بوڑھے، یا وہ مرد تھے اور یہ خواتین۔ ایک جماعت کا مکمل طور پر انکار کرنا اور ایک کا مکمل طور پر ساتھ دینا، یہ ابتداء ہی میں میرے لیے ایک امتحان تھا۔ یہی ابتداء تھی اس تحریک کی۔

مختصر یہ کہ عصر تک ہم اسی موٹر سائیکل پر طلباء کو دعوت دیتے رہے۔ اس طرح کل ۵۳ افراد نے ہمارے پاس اپنے نام لکھوا دیے۔ توکل محض کے نتیجے میں ۵۳ افراد تیار ہوئے جن کو مَیں نے ہدایت کی کہ آپ سب کل سنگ حصار آجائیں لیکن وہ رات کو تقریباً ایک بجے کے قریب ہی سنگ

حصار پہنچ گئے۔ یہی تحریک کی ابتداء تھی۔ صبح ہی ہمارے ایک ساتھی مولوی صاحب امامت کے لیے فجر کی نماز پڑھانے گئے۔ نماز کے بعد ان کے مقتدی نے مولوی صاحب کو اپنا خواب سنایا کہ مَیں نے خواب دیکھا کہ ہمارے علاقے سنگ حصار میں فرشتے تشریف لائے ہیں۔ صبح ۱۰ بجے حاجی بشیر نے ہمیں دو گاڑیاں دیں، جس میں ہم میوند کے علاقے کشت نخود گئے۔ یہاں بہت سے لوگ ہمارے ساتھ شامل ہوئے۔ اس کے بعد ہم نے کہیں سے تین اور کہیں سے پانچ کلاشنکوف لوگوں سے خریدیں اور کہیں کوئی ساتھی مفت میں اسلحہ دینے پر آمادہ ہو جاتا۔ یہاں ہماری تعداد بھی بڑھتی گئی اور تحریک کا باقاعدہ آغاز ہوا۔

صلیبی جارحیت کے خلاف جہاد کا تسلسل

امریکی جارحیت کے آغاز سے ہی ملا عمرؒ کا خیال تھا کہ اگر بالفرض براہ راست جنگ میں طالبان شکست کھا جائیں تو امریکی جارحیت پسندوں کے خلاف بھی سوویت یونین کی طرح گوریلا جنگ شروع کی جائے گی، تاکہ امریکا ایک طویل جنگ میں گر کر تھک ہار کر شکست کھا جائے۔

جارحیت کے آغاز سے چند دن قبل ۲۷ ستمبر ۲۰۰۱ء کو امیر المؤمنین مرحوم نے ریڈیو صدائے شریعت پر ایک طویل خطاب کیا۔ اس خطاب میں ایک جگہ فرمایا: ''اے امریکا اور اس کے حامیو! تم کتنے خام خیال لوگ ہو۔ طالبان کی حکومت کوئی ایسی حکومت تو نہیں جس طرح ظاہر شاہ کی تھی۔ ظاہر شاہ روم کے دورے پر گیا تو پیچھے سے عسکری نظام نے بغاوت کر دی۔ اس کی ساری فوج نے نئے نظام کو تسلیم کر لیا اور ہتھیار ڈال دیے۔ طالبان کا نظام تو منظم جہادی گروپوں پر مشتمل ہے۔ منظم محاذ ہیں۔ بظاہر چلو یہ نظام سقوط کر جائے، لیکن یہ محاذ پھر سے دیہی علاقوں اور پہاڑوں کی طرف عقب نشینی کر کے پھر سے منظم ہو جائیں گے۔ پھر تمہاری کیا حالت ہو گی؟ پھر وہی کمیونسٹوں کی حکومت والے حالات ہوں گے۔ پھر تم کیسے حکومت کر سکو گے؟ تمہاری فوج کون سی ہو گی؟ اگر تمہاری طرف سے امریکی لڑیں گے تو کمیونسٹوں کے ساتھ روسی فوج تھی پھر وہ کہاں چلے گئے؟ تم کیسے اپنا دفاع کر سکو گے؟ اب بھی خوب سوچ لو، خود کو تباہ نہ کرو، خود کو غرق نہ کرو، یہ مسلمانوں کا ملک ہے۔ افغانستان مسلمانوں کا ٹھکانہ ہے۔ اس پر اللہ کی خاص نظر ہے''۔

امیر المؤمنینؒ کے اس خطاب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان معاصر سیاسی رہنماؤں کی طرح

نہیں تھے کہ حکومت کے خاتمے کے بعد میدان چھوڑ کر کسی اور ملک میں سیاسی پناہ لے لیں گے۔ اسی طرح اس جانب بھی اشارہ تھا کہ امریکی یہ نہ سوچیں کہ طالبان کی حکومت کے خاتمے اور بڑے شہروں پر ان کے قبضے سے سب کچھ ختم ہوجائے گا۔ بلکہ طالبان شہروں سے عقب نشینی کر کے دیہی علاقوں اور پہاڑوں پر چلے جائیں گے اور پھر پہاڑوں سے بیرونی جارحیت پسندوں اور ان کے مقامی ہمنواؤں کے خلاف ناقابل شکست مزاحمت کا آغاز کریں گے۔

قندھار شہر پر قبضے کے بعد امریکا کا خیال تھا کہ اب افغانستان کا قضیہ نمٹ چکا ہے اور جنگ ختم ہوچکی ہے۔ اسی لیے تو امریکی وزیر دفاع ڈونلڈ رمز فیلڈ نے اپنے پہلے دورہ افغانستان میں اپنے فوجی آپریشن کی کامیابی کا اعلان کر دیا۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ انہیں استعمار کے قبرستان کی مزاحمتی خاصیت کا پورا ادراک نہیں تھا، اس لیے وقت سے پہلے ہی کامیابی کا اعلان کر دیا۔

اب اس بات کا امریکی عسکری ماہرین بھی اعتراف کرتے ہیں کہ اس وقت امریکی حکام نے افغانستان کے حالات کا صحیح ادراک نہیں کیا تھا۔ عسکری امور کے امریکی ماہر ڈیوڈ کال کلین جنہوں نے ''جدید گوریلا جنگیں'' کے نام سے کتاب بھی لکھی ہے جو ۲۰۰۹ء میں شائع ہوئی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: ''ہمارے رہنماؤں کو چاہیے تھا کہ طالبان کے سقوط کے بعد کے حالات میں سابق برطانوی جنرل کیرو (Sir Olf Caroe) کی وہ بات یاد رکھتے، جو افغانستان میں جنگ اور شکست کے تجربات کی روشنی میں اس نے کہی ہے کہ ''دیگر خطوں میں جنگ کے برخلاف افغانستان میں حقیقی جنگ اس وقت شروع ہوتی ہے جب تمہیں جنگ جیت جانے کا یقین ہوجاتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ افغانستان میں داخل ہونا اور شہروں پر قبضہ کرنا تو آسان ہوتا ہے مگر پورے ملک پر قبضہ بہت مشکل ہے''۔ ڈیوڈ کلین کا کہنا ہے کہ مغربی قوتوں کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے افغانستان میں داخل ہونے کو ہی اپنی کامیابی سمجھ لیا۔ حالانکہ اصل جنگ اس کے بعد ہی شروع ہونے والی تھی۔

امریکی جارحیت پسندوں کے خلاف دو ماہ براہ راست جنگ اور مورچہ بند مزاحمت واقعتاً ایک طویل جنگ کا آغاز تھا۔ امیر المؤمنینؒ امریکا سے براہ راست جنگ اور زندگی کی آخری سانسوں تک لڑنے کی تاکید کر رہے تھے اور ساتھ ہی امریکی جارحیت کے خلاف طویل جنگ کی تیاری بھی کر رہے تھے۔ اسی لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ قندھار چھوڑ کر زابل میں امیر المؤمنین کی

روپوشی دراصل روپوشی نہیں گھات لگانے کی تیاری تھی۔ قندھار چھوڑنے سے قبل ان کی گفتگو اور کچھ اقدامات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

امیر المؤمنین کے قریبی ساتھی ملا گل آغا آخند کہتے ہیں: طالبان جب قندھار اور اس کے مضافات کے علاقے خالی کر کے جانے لگے تو کچھ طالبان رہنماؤں کا خیال تھا اور انہوں نے امیر المؤمنینؒ کو اس کا مشورہ بھی دیا کہ یہ صوبہ قندھار ان سابقہ جہادی کمانڈروں کے حوالے کر کے جائیں جو طالبان سے کسی حد تک ہمدردی اور قربت رکھتے تھے اور عوام میں بھی ان کی کچھ نہ کچھ مقبولیت تھی جیسے حاجی بشیر، ملا نقیب اور جلدک کے ملا عبدالکریم وغیرہ۔ مگر امیر المؤمنین نے جواب دیا کہ اوّل تو مَیں کوئی بھی علاقہ (رسمی طور پر) کسی کو حوالے کر کے نہیں جاؤں گا۔ پھر اگر مصلحت کی خاطر ہم کوئی شہر چھوڑ کر جا رہے ہیں تو ہمارے بعد کوئی ایسا شخص نہ آئے جو عام لوگوں کو ساتھ ملا کر امریکی جارحیت اور حاکمیت پر انہیں قائل کرے، انہیں جارحیت کو تسلیم کرنے پر آمادہ کرے۔ ہم امریکا کے خلاف جہاد کریں گے اور اس جہاد میں ہمیں عوام کی حمایت کی ضرورت ہوگی۔ تو حکومت ایسے لوگوں کے حوالے نہ کرو جو کل کو عوام کے لیے دلیل بن جائیں اور ان کی وجہ سے کل کو سب لوگ گمراہ ہو کر کفار کے ساتھی بن جائیں۔

ملا گل آغا کا کہنا ہے کہ امیر المؤمنینؒ نے آخری دنوں میں مجھے حکم دیا کہ امارت کے بجٹ میں ڈھائی ملین ڈالر کی رقم موجود ہے۔ یہ رقم امارت اسلامیہ کے رہنماؤں اور عسکری کمانڈروں میں اس پیغام کے ساتھ تقسیم کرو کہ یہ رقم تمہارے ذاتی استعمال کے لیے نہیں بلکہ اس سے اپنے اپنے علاقوں میں جہادی امور کا بندوبست کرتے رہو۔ مجاہدین کی مدد اور وسائل کا انتظام کرو، جب تک ہمارا دوبارہ رابطہ بحال ہو اور منظم کام شروع ہو۔ ان تمام امور سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر المؤمنینؒ جارحیت پسندوں کے خلاف جہاد کے اجرا کا یقینی فیصلہ کر چکے تھے اور اس کے لیے انہوں نے زابل کو اپنے خفیہ مورچہ کے طور پر منتخب کیا تھا۔

قندھار شہر سے سورغر کے دامن تک

۵ دسمبر ۲۰۰۱ء، بیس رمضان المبارک کی دوپہر کو امیر المؤمنین اپنے دو ساتھیوں ملا عزیز اللہ اور ملا عبدالباری کے ساتھ ایک جے ٹورین (سراچہ) کار میں قندھار شہر سے قندھار۔ کابل

شاہراہ پر نکل پڑے اور اسی دن شام کو ضلعی سیوری کے گاؤں عمر زو پہنچے۔ یہ ضلع صوبہ زابل کے مرکز کلات کے جنوب میں واقع ہے۔ سورغر کے مشہور پہاڑ کے شمالی جانب مشرق سے مغرب تک یہ آبادی پھیلی ہوئی ہے۔ یہ ضلع امارت اسلامیہ کی حکومت سے قبل قریبی ضلع شینکی کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔ امارت اسلامیہ نے اپنے دورِ حکومت میں اسے الگ ضلع کا درجہ دیا۔ اس کی آبادی بہت کم ہے۔ یہاں کے لوگوں کا ذریعہ معاش انگور اور بادام کے باغات ہیں۔ امیر المؤمنین نے قندھار چھوڑنے کے بعد بقیہ ساری زندگی اسی ضلع میں گزاری۔ ذیل میں اس کی تفصیلات پر روشنی ڈالیں گے۔

زابل ضلع سیوری میں پہلا مشاورتی اجلاس

ضلع سیوری پہنچنے کے بعد امیر المؤمنین نے ملا عبدالجبار عمری کو حکم دیا کہ زابل صوبہ کے تمام ممتاز مجاہدین اور گروپ کمانڈروں کو جمع کرے۔ اس اجلاس میں زابل کے اکثر مجاہدین رہنما شریک ہوئے۔

اس مشاورتی اجلاس کے آخر میں ملا محمد عمر مجاہدؒ نے مجاہدین کو مستقبل کے متعلق ضروری ہدایات دیں۔ اس وقت تک طالبان نے صوبہ زابل خالی نہیں کیا تھا بلکہ انخلا کی تیاری میں تھے۔ امیر المؤمنین نے زابل کے مجاہدین سے یہ بھی کہا کہ یہاں کمانڈر حمیداللہ کی حاکمیت کا راستہ روکو۔ حمیداللہ ایک جنگجو کمانڈر تھا جو حامد کرزئی کا ساتھی تھا۔ امریکا نے طالبان کے بعد صوبہ زابل پر قبضے اور اقتدار کے لیے اسے چن لیا تھا۔ یہ شخص قندھار سے زابل کے ضلع ارغنداب پہنچ چکا تھا اور چاہتا تھا کہ مرکز کلات پر قبضہ کرے۔

شینکئی روانگی

ضلع سیوری کے اس پہلے مقام پر چند دن ٹھہرنے کے بعد وہ اسی گاؤں میں واقع اپنے دوست عمری صاحب کے ایک دوست عبدالحمید آغا کے گھر پہنچے۔ عبدالحمید آغا کے گھر کے افراد کہیں اور چلے گئے تھے اس لیے یہ مکان خالی پڑا تھا جہاں وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ چند دن رہے۔ پھر یہاں سے زابل کے ضلع شینکئی گئے جہاں اپنے بہنوئی مولوی عبدالرحمن صاحب کے گھر میں رہنے لگے۔ یہ امیر المؤمنین کی ماں شریک بہن کا گھر تھا۔ کچھ دن یہاں گزارنے کے بعد

شینکئی ہی میں مشہور عالم مولوی محمد اکرم صاحب کے گھر منتقل ہو گئے اور چند دن یہیں قیام کیا۔اس دوران جب ان کا قیام ضلع شینکئی میں تھا انہوں نے اپنے کچھ عسکری ذمہ داران کا اجلاس بھی بلایا۔اس اجلاس میں بھی جہاد کے تسلسل اور اجراء پر گفتگو ہوئی۔قندھار میں امارت اسلامیہ کے دور حکومت میں مالیات کے انتظامی مسئول ملا عبدالباری جو اس اجلاس میں شریک تھے، انہوں نے بتایا کہ یہ اجلاس رات کو منعقد ہوا۔اجلاس میں شریک ہونے کے لیے ہم اس گھر پہنچے جہاں امیر المؤمنین کا قیام تھا۔برآمدے میں گیس سلینڈر سے روشنی کا انتظام کیا گیا تھا جس کی روشنی میں اجلاس جاری تھا۔بات اس پر ہو رہی تھی کہ اب کیا، کیا جائے اور جہادی کارروائیوں کو تسلسل کیسے بخشا جائے؟

کچھ ساتھیوں کا کہنا تھا کہ کچھ عرصہ انتظار کر لیتے ہیں، امریکی بہت جوش میں ہیں، بعد میں کارروائیوں کا آغاز کریں گے مگر ملا صاحب کا کہنا تھا کہ نہیں ہر شخص اپنے اپنے علاقے میں کام شروع کر دے۔اجلاس کے اختتام پر انہوں نے ملا عبدالرزاق نافذ سے کہا کہ اپنے اصل علاقے ارزگان نہ جائے بلکہ یہیں ان کے آس پاس قیام کرے۔اسی لیے ملا عبدالرزاق نافذ نے کافی عرصہ وہیں قیام کیا۔مگر جب سیکورٹی خدشات کی بنا پر امیر المؤمنینؒ نے تنہا زندگی اختیار کر لی اور صرف ایک مخصوص قاصد کے ذریعے مجاہدین سے رابطوں کا سلسلہ شروع کیا تو ملا عبدالرزاق بھی زابل چھوڑ کر اپنے علاقے ارزگان چلے گئے۔

امیر المؤمنین نے رمضان کے آخری ایام اور عید الفطر شینکئی ہی میں گزارے۔یہ ایسا وقت تھا جب پورے ملک میں امریکا کی فوجی کارروائیاں، پروپیگنڈا اور نفسیاتی جنگ بہت شدت سے جاری تھی۔ریڈیو چینلز پر امریکا کی کامیابیوں اور امارت اسلامیہ کے رہنماؤں کی گرفتاریوں اور شہادتوں کی خبریں مسلسل آرہی تھیں۔زابل ہی کے ایک سابق جہادی کمانڈر نور اللہ نے امیر المؤمنینؒ کو مشورہ دیا کہ وہ پاکستان چلے جائیں اور اس کے لیے وہ پوری طرح سے تعاون کرنے کو تیار ہیں۔مگر امیر المؤمنین نے پاکستان جانے کا مشورہ مسترد کر دیا اور کہا میں یہیں پر رہنا زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔

ضلع سیوری کی طرف واپسی

امیر المؤمنین اور ان کے دو ساتھیوں ملا عزیز اللہ اور ملا عبدالباری جو پچیس رمضان کو شینکئی

گئے تھے،عید کے چوتھے روز ۱۹ دسمبر ۲۰۰۱ء کو ملا عبدالجبار عمری کی رہنمائی میں واپس ضلع سیوری لوٹ آئے۔ یہاں انہوں نے ابتداء میں خورچ نامی ایک گاؤں میں ملا عبدالکبیر اخوند کے گھر میں ۱۸ دن گزارے۔ پھر اسی ضلع میں ایک دوسرے گاؤں خوڑی منتقل ہو گئے۔ یہاں ایک اور مجاہد استاد عبدالصمد کے گھر میں رہائش اختیار کی۔ ضلع سیوری میں یہ وہی گھر ہے جہاں امیر المؤمنینؒ ۲ جنوری ۲۰۰۲ء سے ۲۰۰۷ء تک رہائش پذیر رہے۔ یہاں ہم اس گھر کا امیر المؤمنین کی پہلی رہائش گاہ کے طور پر ذکر کریں گے۔

پہلی جائے رہائش

اس گھر میں امیر المؤمنینؒ اور ان کے ساتھی ملا عزیز اللہ اخند، ملا عبدالباری اخند اور ملا عبدالجبار عمری نے رہائش اختیار کی۔ یہ لوگ گھر کے ایک طرف بنے کمروں میں رہنے لگے، جن کے دروازے پر ہمیشہ باہر سے تالا پڑا رہتا تا کہ گھر آنے جانے والے پڑوسیوں کو شک نہ پڑے کہ یہاں بھی کوئی ہے۔ ابتدائی دن یہاں سردی کے دن تھے اس لیے یہاں انگیٹھی جلانے کی ضرورت پڑتی مگر دن کو اس لیے یہاں انگیٹھی نہیں جلائی جاتی تھی تا کہ چھت سے نکلنے والا دھواں دیکھ کر پڑوسی شک نہ کرنے لگیں کہ اس خالی کمرے کی چمنی سے دھواں کیسے اٹھ رہا ہے؟ گھر میں اگر کوئی مہمان آجاتا تو بلند آواز سے بات کرنے سے بھی احتراز کیا جاتا۔ سردیوں کے اختتام اور بہار کی آمد پر ان کے ساتھی عبدالجبار عمری صاحب ان کی اجازت سے چلے گئے اور دو ساتھی ملا عزیز اللہ اور ملا عبدالباری امیر المؤمنینؒ کے پاس رہ گئے۔

عمری صاحب کا کہنا ہے کہ جب تک میں ان کے ساتھ تھا تو سالن وغیرہ ہم خود بنا لیتے تھے۔ تیار روٹی اور سالن کے لیے ضروری چیزیں اہل خانہ فراہم کر دیتے جو ہم اسی کمرے میں تیار کرتے۔ ملا عمرؒ کا مزاج ایسا تھا کہ وہ دوستوں کے درمیان کوئی امتیازی شان پسند نہیں کرتے تھے۔

اسی گھر کے ایک فرد اور امیر المؤمنین کے میزبان حاجی عبدالاحد نے بتایا: امریکی جارحیت کے ابتدائی دنوں میں ملا عبدالجبار عمری ہمارے گھر آئے۔ میرے بڑے بھائی سے کہا کہ امیر المؤمنین کی سیکورٹی کے لیے مجھ سے تعاون کرو۔ ہم نے رضا مندی ظاہر کی۔ اگلی رات امیر المؤمنینؒ، ملا عبدالجبار عمری، ملا عزیز اللہ اور ملا عبدالباری ہمارے گھر آگئے اور مستقل رہائش اختیار

کر لی۔ کئی ماہ تک ان کے ساتھی بھی ان کے ساتھ رہے۔ ہم نے انہیں کتابیں لا کر دیں۔ وہ سب ہر وقت مطالعہ میں مصروف رہتے۔ کچھ عرصہ بعد ان میں سے ایک دوست چلے گئے۔ ان کے دو ساتھی دو سال تک ان کے ساتھ یہیں رہے۔ بعد میں امیر المؤمنین نے ان دو کو بھی رخصت کر دیا اور اکیلے رہنے لگے۔ آپؒ تلاوت زیادہ کرتے اور اکثر وقت کتابوں کے مطالعے میں صرف کرتے۔ ریڈیو سنتے۔ سر گھٹنوں پر رکھ کر بہت دیر تک مراقبے میں مصروف رہتے۔ کبھی ہم گھر کے چھوٹے گود میں کھیلنے والے بچے لے کر ان کے پاس جاتے، جن سے کھیل کر وہ دل لگی کرتے۔

امیر المؤمنین کو ہم نے ملا عبداللہ اخند کا نام دیا تھا۔ پہلے ہم نے گھر کے ایک حصے میں انہیں دو کمرے دیے تھے جن کے دروازے آمنے سامنے کھلتے تھے اور ان کے درمیان بند کوریڈور تھا جس کے دروازے کو ہم نے باہر سے تالا لگایا ہوا تھا۔ بظاہر کسی کو شک نہیں ہوتا تھا کہ یہاں کوئی ہوگا۔ ہمارے گھر میں کسی کا آنا جانا کم ہو، اس کے لیے ہم نے اپنے رشتہ داروں حتیٰ کہ اپنے بھائیوں سے بھی تعلقات کم کر لیے تھے۔ صرف گھر کے بڑے مرد اور خواتین کو خبر تھی۔ ہماری ماں، جس کا اب انتقال ہو چکا ہے، انہوں نے اس میں بہت تعاون کیا۔ بہت مہارت سے یہ راز چھپائے رکھا۔ بعد میں ہم نے باغ میں مکان بنوایا اور وہاں منتقل ہو گئے۔ مگر وہاں مسئلہ یہ پیش آیا کہ یہ نیا مکان گاؤں کی آبادی سے کچھ فاصلے پر تھا۔ جب امریکی فوجیوں کا چھاپہ پڑتا تو ان کی گاڑیاں اور ہیلی کاپٹر ہمارے گھر کے قریب آ کر رُک جاتے۔ اس لیے ہم واپس اپنے پرانے مکان منتقل ہو گئے اور امیر المؤمنین کی حفاظت کے لیے ایک نئی ترکیب بنائی۔

گھر کے ایک کونے میں دیگر کمروں کے تسلسل میں بیچ میں ایک ایسا کمرہ بنایا جس کے متعلق کسی انجان آدمی کو بآسانی معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ یہاں بھی کوئی کمرہ ہوگا۔ اس کمرے کا دروازہ صرف برابر والے کمرے سے کھلتا تھا۔ اور وہ دروازہ ایسا بنایا گیا تھا کہ بظاہر دیوار میں چنی ہوئی الماری لگتا تھا۔ اس الماری نما دروازے سے امیر المؤمنین کے خاص کمرے میں آنا جانا ہوتا تھا۔

امیر المؤمنین ملا محمد عمر مجاہدؒ نے امریکی جارحیت کے بعد روپوشی کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ اسے کوئی ان کا خوف نہ سمجھے کیونکہ وہ امریکا سے چھپے نہیں بلکہ گھات لگائے ہوئے تھے۔ یعنی وہ جانتے تھے کہ امریکا کے پاس عسکری لحاظ سے وسائل بہت زیادہ ہیں اور آمنے سامنے جنگ میں وہ طاقتور ہوگا۔ جس طرح عام مجاہدین نے محاذوں کی کھلی جنگ کی جگہ گوریلا کارروائیاں شروع کیں

اور گروپ بند حملوں کی جگہ خفیہ کارروائیوں کا آغاز کیا تو امیر المؤمنینؒ نے بھی اعلانیہ کی بجائے مخفی رہ کر متحرک رہنے کا فیصلہ کیا تا کہ امریکا کو ایک طویل اور حوصلہ شکن جنگ میں گھیر لیا جائے۔

ایسی مصلحتوں کی خاطر خود کو روپوش کرنا پیغمبروں کی سنت اور امت کے اکابر کا طریقہ رہا ہے۔ جس طرح رسول اکرم ﷺ جب مکہ مکرمہ سے ہجرت کے وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ کچھ راتیں غار ثور میں رہے کیونکہ کفار نے آپ ﷺ کے سر کی قیمت سو اونٹ مقرر کی تھی۔ مشرکین آپ ﷺ کے پیچھے یہاں تک آئے کہ غار ثور کے دہانے پر کھڑے ہو گئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ آنحضرت ﷺ سے فرمانے لگے کہ اگر یہ لوگ اپنے قدموں میں دیکھیں تو ہمیں دیکھ لیں گے۔ آنحضرت ﷺ کو اللہ کی ذات پر کامل یقین تھا اس لیے فرمایا کہ تمہیں کیوں فکر ہے ان دو لوگوں کے متعلق جن کا تیسرا اللہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت کریں گے۔ ایسا ہی ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ اور ان کے ساتھی حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اسی اخفا اور احتیاطی تدبیر کی بنا پر نجات دی۔ واقعہ یہ ہے کہ امیر المؤمنینؒ کی حفاظت بھی اللہ تعالیٰ کا خاص فضل اور اس عظیم مجاہد کی واضح کرامت تھی۔ کیونکہ وہ ایسے علاقے میں رہ رہے تھے جہاں امریکی فوجیوں کا بار بار چھاپہ پڑتا تھا۔ ان کی حفاظتی تدابیر بھی بہت معمولی تھیں اور صرف اس میزبان کی ذاتی ذہانت اور ایجاد کا کرشمہ تھیں جہاں امیر المؤمنینؒ رہتے تھے۔ امریکی کئی بار ان کی جائے رہائش کے قریب آئے مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے امریکیوں کے شر اور اذیت سے ان کی حفاظت فرمائی۔

''میں اپنی فہم کا مکلف ہوں''

امریکی جارحیت کے ابتدائی سال امریکا کے عسکری دباؤ اور انٹیلی جنس تلاشیوں کے حوالے سے بہت حساس تھے۔ امریکا جو عسکری جارحیت اور کامیابی کے نشے میں تھا افغانستان کے تمام شہروں اور دیہاتوں حتیٰ کہ پہاڑوں اور صحراؤں میں بھی گشت اور سرچ آپریشن کرتا رہا۔ دوسری جانب امارت اسلامیہ کے مجاہدین اور خاص طور پر ملا عمر مجاہدؒ کی گرفتاری پر بھاری انعام بھی مقرر کیا گیا تھا۔ ان کی تلاش کے لیے دیہاتوں میں ہیلی کاپٹروں سے پمفلٹ بھی گرائے جاتے۔ ایسے حالات میں اور ان ابتدائی سالوں میں افغانستان کے اندر رہنا وہ بھی ایسے انتہائی مطلوب ترین شخص کے لیے، خطروں سے خالی نہ تھا۔ ان سب کے باوجود امیر المؤمنینؒ زابل جیسے صوبے میں

ساری زندگی رہے۔زابل وہ صوبہ ہے جہاں ملک کے دوسرے علاقوں کی بنسبت سب سے پہلے امریکا کے خلاف جہاد اور عسکری کارروائیوں کا آغاز ہوگیا تھا جس سے امریکیوں کی ساری توجہ اسی علاقے پر مرکوز ہوگئی تھی۔

ان کے ساتھی اور قاصد ملا عزیز اللہ اخند جو اس دوران پہلے ان کے ساتھی رہے پھر قاصد کے طور پر ان سے اکثر ملتے رہے، ان کا کہنا ہے کہ ہم امیر المؤمنین سے کہتے کہ اس علاقے میں رہائش آپ کے لیے خطرناک ہے۔اسی طرح لوگوں میں یہ باتیں پھیلنے لگی تھیں کہ امریکی فوجیوں کے پاس کھوجی کتے ہیں جس سے تلاشی کے دوران وہ لوگوں کو ڈھونڈتے ہیں۔ایسی باتیں سن کر ہمیں امیر المؤمنین کی حفاظت کی فکر لاحق ہوجاتی۔مگر جب یہ باتیں ہم ان سے کہتے تو وہ فرماتے مجھ سے ایسی باتیں نہ کرو۔میں (اللہ کی طرف سے) اپنی فہم اور اپنی تدبیر کا مکلف ہوں۔مجھے میری فہم کہتی ہے کہ میں یہیں افغانستان میں زیادہ پرامن ہوں۔اللہ تعالیٰ ہی میری حفاظت فرمائیں گے۔میں تمہاری فہم کا مکلف نہیں ہوں۔

امیر المؤمنینؒ کا جذبۂ توکل انتہائی بلند تھا۔انتہائی سخت حالات میں بھی ان کے چہرے پر گھبراہٹ اور پریشانی کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔اللہ تعالیٰ پر ان کا کامل یقین تھا کہ وہ ان کی حفاظت فرمائیں گے۔یہاں تک کہ کبھی کبھی قسم کھا کر کہتے کہ امریکی اور ان کے کٹھ پتلی مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ان کا توکل اس وقت کسی کے لیے قابل فہم نہ ہوتا۔مگر بعد میں معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ایسی ہی حفاظت فرمائی جس طرح ان کا اللہ پر یقین تھا۔

امریکیوں کی تلاشی

اسی خاندان کے ایک فرد حاجی عبدالاحد نے بتایا کہ امیر المؤمنین جب تک ہمارے گھر میں رہے ہمارے گاؤں پر چار بار امریکی فوجیوں کا چھاپہ پڑا مگر ہر بار اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت فرمائی۔ایک دن صبح سویرے جب ہم نماز کے لیے جاگے تو کیا دیکھا کہ سارا گاؤں امریکی فوجیوں سے بھرا پڑا ہے۔ہمارے گھر میں لکڑیوں کا ایک بڑا ڈھیر لگا ہوا تھا جس کا درمیانی حصہ ہم نے خالی رکھا تھا اور ضرورت پڑنے پر آدمی اس میں داخل ہوسکتا تھا۔امیر المؤمنین نے احتیاطاً اپنے ساتھیوں سمیت اس میں پناہ لے لی۔امریکی فوجیوں نے کچھ گھروں کی تلاشی لی اور

چلے گئے۔ تلاشی ہمارے گھر تک نہ پہنچ سکی۔

دوسری بار شام کا وقت تھا جب امریکی فوجی آئے۔ ہم گھر پر موجود نہیں تھے۔ ہماری والدہ جو ہماری غیر موجودگی میں گھر کی سرپرستی کرتی تھیں وہ بھی اس وقت گھر سے نکل کر کسی پڑوسی کے گھر گئی تھیں۔ انہیں جب امریکیوں کی آمد کی اطلاع ملی تو دوڑتی ہوئی اپنے گھر آئیں۔ گاؤں میں جگہ جگہ اور ہمارے گھر کے سامنے ان کی بکتر بند گاڑیاں کھڑی تھیں۔ کچھ دیر ان کا گشت رہا اور پھر چلے گئے۔ امیر المؤمنین کو ان کی آمد کا پتہ ہی نہ چلا۔

ایک دفعہ دوپہر کا وقت تھا جب امریکی فوجی ہمارے گاؤں آئے۔ پورے گاؤں میں تلاشی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ امیر المؤمنین اپنے خفیہ کمرے میں تھے۔ امریکی فوجی ہمارے گھر میں داخل ہوئے۔ گھر کے تمام کمرے چیک کیے۔ کھوجی کتے بھی ان کے ساتھ تھے۔ خاص اس جگہ بھی پہنچے جہاں سے الماری نما دروازے سے امیر المؤمنین کے کمرے کی طرف دروازہ کھلتا تھا مگر وہ سمجھ نہیں سکے اور نہ ان کے کتوں کو اس کا احساس ہو سکا۔ امریکی واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ہم ملا صاحب سے ملے، وہ اطمینان سے بیٹھے تھے اور کہہ رہے تھے: بےفکر رہو، ہماری حفاظت اللہ کرے گا۔

ایک دن صبح سویرے پھو پھٹنے کا وقت تھا جب ہیلی کاپٹر گاؤں میں اترے۔ ہمارے گھر کے قریب ندی کے پاس بھی تین چینوک ہیلی کاپٹر لینڈ کر گئے۔ گاؤں کے بالائی گھروں سے گھر گھر تلاشی شروع ہوگئی۔ جو لوگ فجر کی نماز پڑھنے گھر سے نکلے تھے سب کو باہر ہی بٹھا دیا۔ ہم مسجد کی طرف نکلے نہیں تھے اس لیے گھر ہی میں پھنس کر رہ گئے۔ اس وقت تلاشی ہمارے گھر کے انتہائی قریب پہنچ چکی تھی۔ تلاشی لینے والے اہلکاروں سے قبل دو خواتین امریکی فوجی اور ایک ترجمان خاتون ہمارے دروازے کی طرف آگئیں۔ پھر گھر کی دہلیز کے اندر آگئیں اور ہمارے گھر کی خواتین سے گفتگو کرنے لگیں، وہ پوچھنے لگیں کہ یہاں طالبان تو نہیں ہیں؟ ہمارے گھر کی خواتین نے کہا نہیں۔ ان کی گفتگو جاری رہی۔ بعد میں جب تلاشی کا سلسلہ ہمارے گھر تک پہنچا تو انہی خواتین اہلکاروں نے جا کر اپنے فوجیوں سے کہا کہ یہاں ہم دیکھ چکیں یہاں کوئی نہیں ہے۔ اس طرح تلاشی کا یہ سلسلہ ہمارے گھر سے آگے بڑھ گیا۔

حاجی عبدالاحد کہتے ہیں کہ امیر المؤمنینؒ اگرچہ پوری احتیاط کرتے کہ دشمن سے کسی طرح سامنا نہ ہو، مگر اپنے کمرے میں اسلحہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے۔ ایک کیوبن شارٹ گن، ایک کلاشنکوف اور ایک بیس بور کا میگا روف پستول بے شمار گولیوں کے ساتھ ہر وقت اپنے پاس رکھتے کہ اگر ممکنہ طور پر امریکی انہیں ڈھونڈ لیتے تو امیر المؤمنین آخری سانس تک ان سے لڑتے اور زندہ خود کو ان کے حوالے نہ کرتے۔

روپوشی کی زندگی میں امیر المؤمنینؒ کی روزمرہ مصروفیات

ملاعبدالجبار عمری جو امیر المؤمنینؒ کی ۱۳ سالہ روپوشی کی زندگی میں اکثر وقت ان کے ساتھ رہے اور ان کی خدمت کی۔ ان کا کہنا ہے کہ امیر المؤمنینؒ فجر کی نماز کی ادائی کے بعد اپنے پرانے معمول کے مطابق سِرّی (آہستہ) اذکار اور وظائف پڑھتے۔ اس کے بعد صبح کا ناشتہ کرتے۔ صبح کے ناشتے میں چینی والی سبز چائے کے ساتھ روٹی کھاتے۔ مگر کھانا بہت کم کھاتے تھے۔ چائے تو صرف صبح اور سہ پہر کو پیتے تھے۔

صبح سے دوپہر تک اکثر وقت ان کی مصروفیت قرآن کریم کی تلاوت، ذکر وفکر، مطالعہ کے لیے تفسیر جلالین، معارف القرآن اور تفسیر کابلی سمیت متعدد تفاسیر، بخاری شریف اور مشکوٰۃ المصابیح سمیت احادیث کی کتابیں اور ہدایہ سمیت فقہ کی کچھ کتابیں انہیں میسر تھیں۔ اس کے علاوہ بھی مختلف کتابیں ان کے پاس ہوتی تھیں، جیسے حیات الصحابہ وغیرہ۔ مگر ان کا زیادہ تر وقت قرآن کریم کی تلاوت اور تفاسیر کے مطالعے میں گزرتا تھا۔ دن میں ایک وقت ریڈیو بھی سنتے اور دنیا بھر اور افغانستان کے حالات سے ہمیشہ خود کو باخبر رکھتے۔

عبدالجبار عمری کہتے ہیں کہ اس طویل عرصے میں مجھے معلوم ہوا کہ امیر المؤمنینؒ کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ کھانا، بولنا اور سونا ان کا بہت کم ہوتا تھا۔ کبھی امتیازی کھانے کا مطالبہ اور توقع نہیں کی۔ جو کچھ افغانستان کے عام غریب گھروں میں پکتا تھا وہی کھاتے۔ کھانا اتنا کم کھاتے تھے کہ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کبھی انہوں نے آدھی روٹی سے زیادہ کھایا ہو۔ بات چیت بھی بہت کم کرتے تھے حتیٰ کہ رسمی اجلاسوں میں بھی ان کی گفتگو بہت مختصر ہوتی تھی۔ صرف اہم اور کام کی بات کر کے خاموش ہو جاتے۔ اجلاسوں میں اکثر وقت خاموش رہ کر دوسروں کی بات سنتے۔ ہر

بات پہلے خوب سن کر سمجھتے اس کے بعد اس پر رائے دیتے۔

امیر المؤمنینؒ کی نیند بہت ہلکی ہوتی تھی۔ ان کے جاگنے اور سونے میں فرق کرنا مشکل ہوتا تھا۔ جتنی بھی گہری نیند سے انہیں جگایا جاتا وہ ایسے جواب دیتے جیسے سوئے ہی نہیں تھے۔ شروع سے ہی بہت کم سوتے تھے۔

قندھار سے نکلتے ہوئے امیر المؤمنینؒ اپنے ساتھ صرف دو جوڑے کپڑے لے کر نکلے تھے۔ ایک پہنا ہوا تھا اور دوسرا ایک اضافی جوڑا۔ ان کے پاس کچھ رقم بھی تھی جن سے وہ اپنا صدقۃ الفطر اور کچھ دیگر ذاتی مصارف ادا کرتے تھے۔ قندھار سے نکلتے ہوئے ان کے ساتھیوں نے ان کے بیگ میں کچھ رقم ان کی لاعلمی میں رکھی تھی۔ روپوشی کے ایام میں ان کے اور ان کے ساتھیوں کے بعض بڑے مصارف اسی رقم سے پورے کیے جاتے۔

امیر المؤمنینؒ روپوشی کے ایام میں بھی ماضی کی طرح طویل کپڑے پہنتے، اور پاج (ایک مخصوص باریک کپڑا جس کی پگڑی افغانستان اور دیگر پشتون علاقوں میں پہنی جاتی ہے) کی بڑی پگڑی پہنتے تھے۔ کپڑے اکثر ان کے خاندان کی طرف سے سلے ہوئے آتے۔

کثرتِ ذکر وفکر ومراقبہ

عبدالجبار عمری کہتے ہیں کہ امیر المؤمنینؒ کی زندگی کے اس تیرہ سالہ دور میں، مَیں نے ان میں کچھ ایسی خصوصیات دیکھیں کہ اگر بیان کروں تو شاید بہت سے لوگ یقین نہ کریں۔ ان میں سے ایک ان کے مراقبے اور تفکر کی کیفیت تھی۔ وہ دن رات ہر وقت مراقبے اور گہری فکر میں ہوتے اور ذکر میں مشغول رہتے۔

امیر المؤمنین کا مزاج تھا کہ وہ کسی کو ڈانٹتے نہیں تھے۔ ایک دن جب مغرب کی اذان ہو رہی تھی، مَیں ان کے کمرے میں آیا۔ وہ مراقبے کی حالت میں تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ سوئے ہوئے ہیں۔ میں نے انہیں جگانے کے لیے آواز دی کیونکہ نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ انہوں نے سر اٹھایا تو مجھے خوب ڈانٹا۔ بعد میں اپنی اس ڈانٹ پر معذرت کرتے ہوئے کہا ''خدا کرے آپ میری ڈانٹ سے ناراض نہ ہوئے ہوں، مَیں سو نہیں رہا تھا مگر اس ذکر وفکر کے وقت کبھی کبھی مجھ پر ایسی حالت آجاتی ہے جس میں اتنی لذت ہوتی ہے کہ وہ لذت مجھے دنیا کی کسی نعمت میں نہیں ملتی۔

مَیں اس وقت ایسی ہی کیفیت میں تھا جب آپ نے آواز دی۔''

عبدالجبار عمری کا کہنا ہے کہ عالمی میڈیا یہ پروپیگنڈا کرتا ہے کہ امیر المؤمنینؒ ایک درشت مزاج اور انتہا پسند شخص تھے مگر ان کی طویل رفاقت میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ معتدل مزاج کے مالک تھے۔ ان کا ہر کام اعتدال سے ہوتا تھا۔ عام زندگی سے لے کر عبادات تک ان کی زندگی کا ایک بہترین وصف جس سے میں متاثر ہوا وہ ان کا صبر تھا۔

تیرہ سالہ تنہائی میں کبھی مَیں نے انہیں بے صبری کا مظاہرہ کرتے نہیں دیکھا۔ کبھی انہوں نے کسی چیز کی شکایت نہیں کی۔ اپنی والدہ (امیر المؤمنینؒ کی والدہ محترمہ اب بھی حیات ہیں) اور اپنے بچوں کو یاد کرتے مگر اپنی تنہائی کے حوالے سے کسی افسوس کا اظہار کبھی نہیں کیا۔ یہاں تک کہ بیماری پر انہیں اس قدر کنٹرول تھا کہ اکثر وقت بیمار اور تکلیف میں ہوتے مگر ان کی حالت دیکھ کر پتا نہیں چلتا تھا کہ بیمار ہیں۔ نہ کسی قسم کی شکایت کرتے۔ بیماریاں برداشت کرتے اور شدید صبر کا مظاہرہ کرتے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا وہ زیادہ گفتگو نہیں کرتے تھے۔ اس لیے ہمیشہ نامناسب گفتگو اور غیبت کی بجائے نصیحت کرتے۔ نصیحت کرتے ہوئے ان کی آواز بلند ہو جاتی۔ ''خدا سے ڈرو'' ان کی نصیحت میں اس جملے کا تکرار زیادہ ہوتا۔ امیر المؤمنین آسائش اور راحتوں کا مزاج نہیں رکھتے تھے۔ انہیں سادہ زندگی پسند تھی۔ کسی سے خدمت یا خاص امتیازی توجہ کی توقع نہیں رکھتے تھے۔ مزاج میں رحم دلی بہت زیادہ تھی۔ اکثر مجاہدین کو نصیحت کرتے کہ کارروائیوں میں احتیاط سے کام لیا کرو تا کہ بے گناہ لوگ نشانہ نہ بنیں۔ عام لوگوں کی شہادت کی خبر سن کر بہت افسردہ ہوتے۔

جس علاقے میں امیر المؤمنینؒ کی رہائش تھی وہاں ایک بار برف باری ہوئی۔ برف باری میں کچھ پرندے ٹھٹھر کر برف کے نیچے دب گئے تھے اور اڑ نہیں سکتے تھے۔ ایسے پرندوں کو بچے پکڑ کر اٹھا لیتے۔ اس گھر کا ایک بچہ ایسا ہی ایک پرندہ اٹھا کر ان کے پاس لایا۔ امیر المؤمنین نے پہلے تو بچے کو بہلا کر پرندہ ان کے حوالے کرنے پر راضی کیا۔ پھر پرندہ ان سے لے کر آتش دان کے پاس رکھ دیا تا کہ گرم ہو کر حرکت کے قابل ہو جائے۔ جب اس کے پر کھل گئے تو خود ہی اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر باہر آئے اور پرندے کو ہوا میں اڑا دیا (جاری ہے)۔

استفسارات　مدیر

جدید اسلامی تحریکیں کیوں کامیاب نہیں ہوسکیں؟

ناکامیوں سے سبق سیکھنا ہی کامیابی کی کلید ہوتا ہے

مستفسر: میرا تعلق جماعت اسلامی سے ہے۔ جماعت کی فکری رہنمائی کرنے والے پرچے عالمی ترجمان القرآن کے جون ۲۰۲۱ء کے شمارے میں اس کے فاضل مدیر جناب پروفیسر خورشید احمد صاحب نے رسائل ومسائل میں ''مسلم معاشروں میں اسلامی تحریکوں کے لیے چیلنج'' اور ''کیا اسلامی تحریکیں عوام کا رُخ نہیں پھیر سکیں؟'' کے عناوین کے تحت جدید اسلامی تحریکوں کے کامیاب نہ ہونے کے اسباب کا مختصر تجزیہ کیا تھا۔ اسی طرح جریدے کے فاضل نائب مدیر پروفیسر سلیم منصور خالد صاحب نے ''اسلامی تحریکوں کی جدوجہد میں توجہ طلب کام'' کے عنوان سے قیادت اور ارکان میں بعض مطلوب (ومفقود) خوبیوں کا ذکر کیا تھا۔

راقم کو یہ بحث تشنہ محسوس ہوئی تھی اور اس کا خیال تھا کہ شاید اگلے شمارے میں ترجمان القرآن کے قارئین اس بحث کو آگے بڑھائیں۔ اسی طرح مجھے توقع تھی کہ آپ اس پر تفصیلی مضمون لکھیں گے لیکن البرہان بھی اس معاملے میں خاموش رہا۔ اس معاملے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

مدیر: عالم اسلام میں جدید اسلامی تحریکیں اور پاکستان میں جماعت اسلامی کیوں کامیاب نہیں ہوسکی، ہمارے نزدیک یہ بہت اہم موضوع ہے۔ اس پر خوب غور وفکر ہونا چاہیے اور اسے وسیع پیمانے پر زیر بحث لانا چاہیے کیونکہ ناکام ہونا نہ مضر ہوتا ہے اور نہ اس میں کوئی عیب کی بات ہے اگر ناکامی کو تسلیم کر کے اپنے فکر وعمل کا معروضی تجزیہ کیا جائے، اپنی غلطیوں سے سبق سیکھا جائے، آگے بڑھنے کے لیے نئی راہیں تلاش کی جائیں اور مسبب الاسباب کی طرف مزید رجوع کیا جائے کہ یہی چیزیں کامیابی کی کلید بن جاتی ہیں اور ان سے ناکامی کامیابی میں بدل جاتی ہے۔

لہٰذا ہمارے نزدیک پروفیسر خورشید احمد صاحب اور پروفیسر سلیم منصور خالد صاحب کے اس موضوع پر مختصر شذرے مفید بھی تھے اور جرأت مندانہ بھی اور اس بحث کو آگے بڑھایا جانا چاہیے تھا۔ اس لیے ہم جماعت کے قائدین اور ان کے حامی دانشوروں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ وسعت نظری وفکری سے کام لیں اور کم از کم اپنے ارکان کو ہی (جو ظاہر ہے ان کے نزدیک قابل اعتماد ہیں) اس موضوع پر تحریری تبادلۂ خیال کی اجازت دیں بلکہ انہیں اس موضوع پر جماعت کے کارکنوں اور ہمدردوں کی تجاویز پر بھی کھلے دل ودماغ سے غور کرنا چاہیے۔

CPL No. 296 August 2021

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

عصری تعلیم کی اصلاح

قیمت

- ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل ۶۰۰
- اسلامی سکول کے خدوخال ۱۵۰
- تعلیم اور اس کا اسلامی کردار ۳۰۰
- یکساں قومی نصاب- خدشات ومضمرات ۲۵۰
- تدریس القرآن ① برائے معلمین (ڈاک خرچ) ۵۰
- تدریس القرآن ① برائے طلبہ وطالبات (ڈاک خرچ) ۵۰
- پنج سورہ (اُردو تفہیم) (ڈاک خرچ) ۵۰
- اسلامی علوم میں تحقیق: اصول، ترجیحات اور معیار ۳۵۰
- ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت (زیر طبع)

طلبہ کی اسلامی تربیت

- تعلیمی ادارے اور کردار سازی ۲۵۰
- تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت- ہینڈ بک و گائیڈ ۳۰۰

اصلاحِ دینی مدارس

- ہمارا دینی نظام تعلیم ۴۵۰
- نصابِ مدنیؒ ۸۰
- مدرسہ ڈسکورسز- مطالعہ وتجزیہ ۲۵۰
- اصلاحِ دینی مدارس ۴۰۰

اسلامی تحریکیں

- پاکستان کی دینی قوتیں غیر مؤثر اور ناکام کیوں؟ ۳۰۰

قیمت

- ایک نئی ہمہ جہت اصلاحی تحریک کی ضرورت (ڈاک خرچ) ۴۰
- خاموش انقلاب- ناگزیر ہے ۳۵۰
- عصر حاضر میں دین کا متوازن تصور ۱۵۰

تزکیۂ نفس

- اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ) ۱۵۰۰
- حقیقت تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً) ۸۰
- اپنی اصلاح آپ کیسے؟ ۸۰
- ترکِ رذائل (احمد جاوید) ۳۵۰
- اسلام اور تعمیر سیرت (زیر طبع)

مغربی فکر وتہذیب

- اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش ۳۵۰
- اسلام اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ ۲۵۰
- اسلام اور ردِ مغرب ۳۰۰

فہم دین

- مسلم نشاۃ ثانیہ- اساس اور لائحہ عمل ۴۷۵
- مقالاتِ امین (جلد اوّل) ۱۰۰۰
- مقالاتِ امین (جلد دوم) ۱۰۰۰
- شاتم رسول کے قتل کی شرعی حیثیت ۵۰

مکتبہ البرہان

15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔ فون 0309-4607124 ای میل ermpak@hotmail.com